ماہنامہ

# قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

شمارہ:113 مئی 2022ء

**QINDEEL-E-ADUB INTERNATIONAL**

103 Peterborough Road Carshalton SM5 1EE London
(M) 0044-7886-304637 (R) 02086482560
www.qindeel-e-adub.co.uk, ranarazzaq52@gmail.com

لندن سے شائع ہونے والا میدانِ ادب کا واحد کثیر الاشاعت بین الاقوامی اردو میگزین

लंदन से सबसे अधिक प्रकाशित होने वाला उर्दू अदका मात्र अंतरराष्ट्रीय मैगज़ीन

***An International Literary Urdu Magazine Globally Circulated***

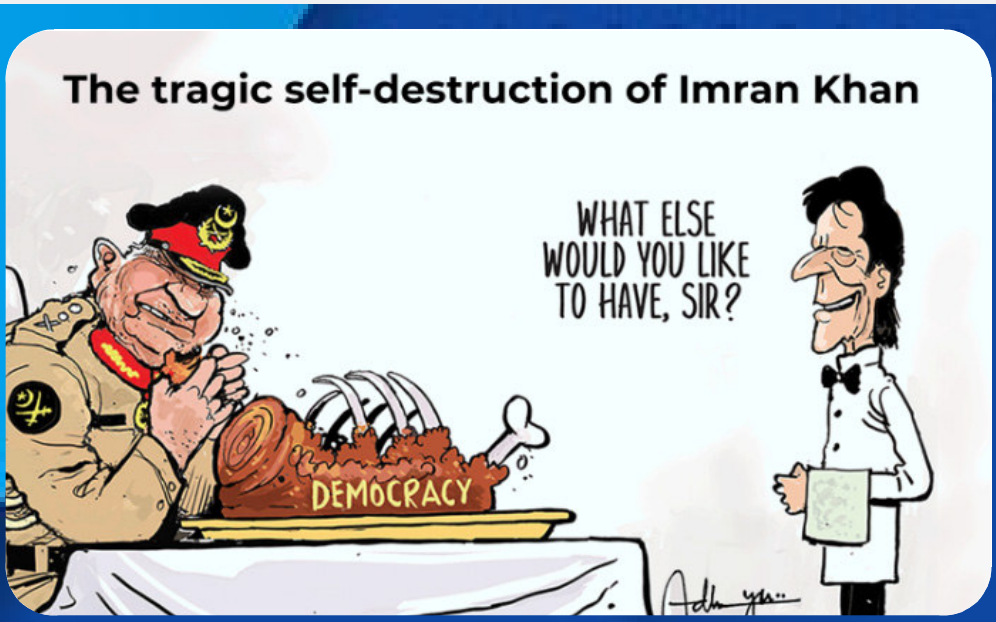

# Earlsfield Properties

Professional Residential Property Management Services

We will manage your property at 0% commission
Guaranteed
Rent Schemes for 3 & 5 years.

Free Management Services
Guaranteed Vacant Possession.

## Get it Right

- Member National Landlord Association
- Member Deposit Portection Schemes
- Member The Property Ombudsman Scheme
- Winner of Pakistan Achievement Award 2014 (Excellence Management)
- Vastly Experience in Housing Benefits Clients.

**PLEASE CONTACT: NAVEED SARWAR (MA EUROPEAN REAL ESTATE)**


175 Merton Road, London SW18 5EF

Tel: 02082656000 02088770762
Fax: 02088749754
Email: info@earlsfieldproperties.com
Web: www.earlsfieldproperties.com

## مجلس ادارت

### بانی اراکین

خان بشیر احمد رفیق مرحوم

آدم چغتائی مرحوم

### مدیر





رانا عبدالرزاق خان

نائب مدیر: مبشر شہزاد، گلاسگو

### اراکین ادارتی بورڈ

ڈاکٹر منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ امجد مرزا امجد، طارق مرزا آسٹریلیا، عبدالقدیر کوکب، بشارت احمد چیمہ۔


### التماس

تمام دوستوں سے التماس ہے کہ اپنی شعری و نثری تخلیقات اور ادبی پروگرامز کی رپورٹیں وغیرہ برائے اشاعت بصورت ''اِن پیج اردو'' فائلز مع تصاویر ای میل سے روانہ فرمائیں۔'' قندیل ادب انٹرنیشنل'' بیسیوں ممالک میں لاکھوں اردو قارئین کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ میگزین کے مندرجات پر آپ کی رائے یا مختصر تبصرے ہمیں اپنا محاسبہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مضامین کے ساتھ ضروری حوالہ جات آپ کے مضامین کی افادیت کو بڑھاتے ہیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر وغیرہ ''کاپی رائٹ فری'' ہونی چاہئیں۔ شکریہ

**IMPORTANT ANNOUNCEMENT**

"Qindeel-e-Adab International" magazine is a non-commercial and non-profit e-product, as well as on paper, internationally distributed free of cost for the promotion of bi-lingual poetry, fiction, informative multi purpose interesting articles etc in Urdu alphabet in the UK and Europe under the sole ownership of its Chief Editor Abdul Razzaq Khan of the address as stated elsewhere within this magazine for delivery of documents.

The magazine and the contents herein DO NOT relate to a political, religious or a social group whatsoever. The Editor does not necessarily agree with the opinions expressed by the article writers, poets etc..

Although the e-magazine is FREE OF COST to all, yet for ON PAPER copies of the magazine we do expect a reasonable amount of donation to cover the costs of printing, postage and packing for all countries as stated

Chief Editor

## فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| غزلیات: منیر باجوہ، طفیل عامر، ڈاکٹر فرزانہ فرحت، راکب مختار، عبدالقدیر کھوکھر، دُعا راجپوت، جبیں نازاں، رئیس صدیقی، لطیف ساحل، ڈاکٹر ظفر جاذب، عبدالحمید حمیدی کینیڈا، عبدالکریم قدسی، پروفیسر مبارک عابد، شہزاد مبشر گلاسگو۔ محمد اشرف کمال، ایم زیڈ کنول، سراج اورنگ آبادی، پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد، آفتاب شاہ، آغا نیاز مگسی، مینا کماری، سلیم کوثر۔ ڈاکٹر منور احمد کنڈے۔ | | 6 تا 10 |
| کرامت راج ایک ادبی شخصیت | صفی اللہ راجپوت، ملتّن، | 11 |
| بلقیس ایدھی ''پاکستان کی ماں'' کا انتقال پرملال | امجد مرزا امجدؔ | 13 |
| آکوثر علی | امجد مرزا امجد | 14 |
| آفتابیات | ادارہ | 15 |
| چوہدری محمد ظفر اللہ خان کو خراج عقیدت | ادارہ | 16 |
| روزہ کشائی۔ پہلا روزہ | رئیس صدیقی | 17 |
| گرنہ بودے درمقابل | احمد منیب | 18 |
| چند شعراء ادباء کا تعارف | ادارہ | 21 |
| منو بھائی کالم نگار ادیب وشاعر | ادارہ | 25 |
| ثاقب زیروی | ادارہ | 33 |
| ایک تعارف فرحت عباس شاہ | ادارہ | 36 |
| دُنیائے افسانچہ کے بانی پرویز بلگرامی کی افطار پارٹی | محسن نقی | 37 |
| ٹاپ ٹرینڈز کی سیاست | بشکریہ 92 نیوز | 38 |
| جستہ جستہ | عطاء القادر طاہر | 40 |
| پتنگ کی ڈور | امجد مرزا امجد | 41 |
| رسہ گیر چوہدری | نعیم احمد باجوہ | 41 |


## اعلان

ماہانہ قندیل ادب انٹرنیشنل میگزین کا سالانہ چندہ 25 برطانوی پونڈ ہے۔ اگر کسی کو گھر پر بذریعہ ڈاک ارسال کرنا پڑے تو 35 پونڈ سالانہ ہے۔

نیچے دیئے گئے اکاؤنٹ میں سالانہ چندہ کی ادائیگی فرمائیں۔ جزاکم اللہ


**رانا عبدالرزاق خان لندن**

**HSBC London UK,**

**A/C 04726979 Sort Code 400500**

(M) 0044-788-304637 (R) 02086482560

# غزلیات

## منیر باجوہ

کتنی حُسیں تھی زندگی گزر گئی جو بچپن میں
دیکھیں کٹھن دشواریاں آ کے ہم نے جوبَن میں
عشق کی کہانیاں عجب قسم کی ہوتی ہیں
عاشقی کا شجر اُگتا ہے دل کے آنگن میں
پنکھ پکھیرو باغ میں سدا ہی چہچہاتے ہیں
خوشیاں ہیں اُنکی دیدنی برستے ہوئے ساون میں
جو خدا سمجھتے ہیں اپنے ہی اکابر کو
رہتے ہیں پھر تا ابد طوق انکی گردن میں
سوچ سکے نہ بہتری آنے والے وقت کی
رہتا ہے وہ تاحیات اسی ایک الجھن میں
وقت سدا ٹھہرتا ایک سا نہیں یہاں
اونچ نیچ چلتے ہیں ساتھ ساتھ جیوَن میں
عرفان کی بلندیاں پاتے ہیں وہی منیر
رکھتے ہیں جو درد، دل کے صاف دامن میں

## طفیل عامر

ہارے بازی ہر دے ہر دے
ڈبے جیہڑے تر دے تر دے
ویکھیں کھیڈ گوا نہ دیویں
اجکل اجکل کر دے کر دے
مل کیہ پئیندا گل ساڈی دا
گل کر دے ساں ڈر دے ڈر دے
بھکھا ساں میں، لگ دے لئی دے
ہے سن سارے پچھ دے سر دے
جیہڑا تینوں بھل نہ سکیا
ناں جپ دا سی مر دے مر دے

## ڈاکٹر فرزانہ فرحت

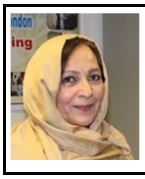

ہوش وخرد میں ہوں نہ کسی بھی جنوں میں ہوں
جانے میں کیسی سوچ میں کیسے فسوں میں ہوں
مجھ کو ترے سوا نظر آتا نہیں ہے کچھ
میں تیرے پیار کی سحرِ سیم گوں میں ہوں
جو کاروانِ شوق ہے اس کو خبر نہیں
کیسی مسافتوں کے میں کن دائروں میں ہوں
چھائی ہوئی ہے چارسو تاریک رات اور
میں الجھنوں میں قید ہوں اور وحشتوں میں
اے آئینے مجھے تُو ذرا آزما کے دیکھ
پتھر تراش تو نہیں شیشہ گروں میں ہوں
کچھ کچھ جو میری آنکھ میں لالی ہے آج تک
خوشیوں میں کم ہوں اور زیادہ غموں میں ہوں
فرحتؔ میں زندگی کی مسافت سے چُور چُور
جانے کہاں ہوں اور میں کن قافلوں میں ہوں

## راکب مختار

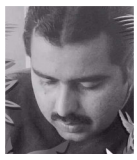

خاکی پیکر ہے مگر خاک نشینوں سے نہیں
شہر سے جائے گا عشاق کے سینوں سے نہیں
تو نے لڑتے ہوئے گالی کا سہارا لیا تھا
صلح انسان سے کرتا ہوں کمینوں سے نہیں
دھوکہ دیتی ہے یہ محراب کی کالک اکثر
لوگ کردار سے کھلتے ہیں جبینوں سے نہیں
ان کی قسمت جنہیں دریا سے محبت تھی بہت
کوئی شکوہ مجھے غرقاب سفینوں سے نہیں
مجھ سے اک پل کی بھی غفلت نہ برتنے والے
رابطہ خود سے مرا کتنے مہینوں سے نہیں
بادشاہا تجھے آئینہ دغا دیتا ہے
تاج انصاف سے سجتا ہے نگینوں سے نہیں
صرف اک قبرِ مقرر کے علاوہ راکبؔ
کوئی لالچ مجھے پرکھوں کی زمینوں سے نہیں

## عبدالقدیر کھوکھر

دُشمن کو خاک میں ملاتا ہوں
غرور نہیں خدا کی ذات پہ یقین رکھتا ہوں
تو اگر مل جائے تو دنیا کو فنا کرتا ہوں
دیتی ہے دنیا نظیر ایسی سنگت ہے آستیں میں
دوستوں سے دوستی اُن پر جان نثار کرتا ہوں
دشمنوں کی پرواہ نہیں پیٹھ کھلی رکھتا ہوں
زباں کھلنے سے پہلے وہ سوچے اتنا اثر رکھتا ہوں
سوار رہتا ہوں دُشمنوں کی سوچوں میں اکثر
دشمنی میں پہلے سے زیادہ سلام گوش گزار کرتا ہوں
تنہا راتوں میں تنہا گلیوں میں آوارہ ہوں
اعتبار کم کرتا ہوں صرف سایہ رکھتا ہوں
قلم اُٹھاتا ہوں تا قلم سے سر قلم کرتا ہوں
دنیا اگر کٹھن ہے تو اِس کو سر بھی میں ہی کرتا ہوں

## دُعا راجپوت

شب ہجراں تجھے گزار آئے
بے قراری تھی اب قرار آئے
پھول منسوب ہو گیا تجھ سے
میرے حصے میں چند خار آئے
جنگ تجھ سے نہیں خود سے تھی
بے خودی میں اِسے بھی ہار آئے
اُف نظر اُس کی پڑ گئی مجھ پر
اُف یہ لمحہ بھی بار بار آئے
تیرے جانے سے لوٹ جاتی ہے
تیرے آنے سے جو بہار آئے
ہائے میخانہ تیری آنکھوں کا
کیوں عطا کو نا پھر خمار آئے

## جبیں نازاں

نہیں بھولے جاناں ادائیں تمھاری
جفائیں، وہ ساری سزائیں تمھاری
یہ دن زندگی میں تمھاری بھی آئے
وفائیں سبھی آزمائیں تمھاری
سنو! گنگناتی ہیں تنہائی بھی
یہ گائیں، پناہیں، صدائیں تمھاری
ہوا بے حیا آئی تھی کس طرف سے
اڑا لے گئی سب ردائیں تمھاری
کبھی زندگی میں کوئی غم نہ آئے
خدا ٹال دے سب بلائیں تمھاری
قدم چومتی ہے جو نصرت ہماری
مقدر بنائیں دُعائیں تمھاری
جھکا کر جبیں تم ندامت کی دیکھو
خدا بخش دے گا خطائیں تمھاری
معافی تلافی، تمھاری بھی خو ہو
بھلا دی جبیںؔ نے خطائیں تمھاری

## رئیسؔ صدّیقی

پل بھر میں برسوں کا رشتہ توڑ دیا
پتھر دِل نے آخر شیشہ توڑ دیا
دیکھ کے اُسکو، پھر دانستہ دیکھ لیا
اِک لغزش نے میرا روزہ توڑ دیا
شاید اُسکی فطری غیرت جاگ اٹھے
ہم نے اِک سائل کا کاسہ توڑ دیا
جھوٹ میں آخر اِتنی طاقت کیوں آئی
اِک ساعت کو سچ کا لہجہ توڑ دیا
اپنی اِس جُرات پر حیرت ہے مجھکو
خواب میں میں نے تجھ سے رشتہ توڑ دیا

## لطیف ساحل

جو بات بات پہ تکرار کرنے والا تھا
وہ شخص ہم سے بہت پیار کرنے والا تھا
تری سواری تلے آکے مر گیا ہے جو
ترا قریب سے دیدار کرنے والا تھا
تمہی نے مان لیا میری بے گناہی کو
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا
خطا یہی تھی کہ چھپ چھپ کہ تیرا نام لیا
یہ جرم تو سرِ بازار کرنے والا تھا
اُداس لوگوں کی تیمار داری کرتے تھے
یہ مشغلہ ہمیں بیمار کرنے والا تھا
میں خود بھی کھوگیا خوابوں کے سحر میں ساحل
اسے میں نیند سے بیدار کرنے والا تھا

## ڈاکٹر ظفر جاذب

ہم اپنے اپنے ہی دائرے میں کھڑے رہے ہیں
جبھی تو فرقت کی سولیوں پہ چڑھے رہے ہیں
اصول چاہت کے سارے کلیے بھلا دیئے تھے
اور اپنی اپنی انا پہ دونوں اڑے رہے ہیں
وفا کے رستے پہ چل رہا ہے وہ آج تک بھی
کہ اس کے حالات چاہے جتنے کڑے رہے ہیں
خلوص نیت سے کب ہوئے ہیں وہ ایک اب بھی
وہ جن کے ماضی میں ہر قدم پر دھڑے رہے ہیں
لگا لیا کر کبھی تو چکر ہماری جانب
کچھ ایسے شکوے مجھے بھی ان سے بڑے رہے ہیں
ہوئے محبت میں سرخرو وہ کہ جو بھی جاذبؔ
کسی کو چن کر اسی کے در پہ پڑے رہے ہیں

## عبدالحمید حمیدی کنیڈا

ہم سے نہ پوچھو بات چہروں کی
کھلتی جاتی ہے ذات چہروں کی
پڑھتے جایئے کتاب چہروں کی
ہے کہاں التفا ت چہروں کی
ادنیٰ اعلیٰ تونگر و نادار
یہ جہاں ہے بساط چہروں کی
مے دیدارِ عام بٹتی تھی
تھی میسر سوغات چہروں کی
ترے در سے اُٹھے وہ ایسے کہ
لُٹ گئی کائنات چہروں کی

معجزہ ہو جو تیری نظروں کا
دن میں ڈھل جائے رات چہروں کی
جذب شوخی سلیقہ مل جائے
دل کو چھو جائے بات چہروں کی
دیکھ کر اُن کو پھول کھلتے ہیں
کلیاں کرتی ہیں بات چہروں کی

## عبدالکریم قدسی

بجھتے چراغ رات بڑی دیر تک لڑے
ہم عظمتوں کے ساتھ بڑی دیر تک لڑے
ہارے ضرور ہیں مگر پسپا نہیں ہوئے
یہ زخم زخم ہاتھ تو بڑی دیر تک لڑے
خیمے اُداس پانی کی اک بوند تک نہ تھی
اور دُور تھا فرات بڑی دیر تک لڑے
قائم عجیب حوصلے تھے تھا شجر شجر
آندھی سے پات پات بڑی دیر تک لڑے
فٹ پاتھ دُور جلد بھی ناقص کتاب کی
اور دُھوپ سے صفحات بڑی دیر تک لڑے
اکثر تو دشمنوں کی اماں میں چلے گئے
قدسیؔ سے پانچ سات بڑی دیر تک لڑے

## پروفیسر مبارک عابد

سوچ میں ست رنگ سورج سمٹے سمٹائے بھی تھے
رقص کرتے مسکراتے جھومتے سائے بھی تھے
میری دستک بھی مقفل ہوگئی ہر در کے ساتھ
اور اُن کی چاپ نے سو در کھلے پائے بھی تھے
میں ابھی سمٹا نہ تھا کہ تو نے پھر بکھرا دیا
وار کرنے کے وگرنہ اور پیرائے بھی تھے
پھر بھی ننگِ خلق ٹھہرے باعثِ عبرت بنے
اپنی عریانی کو ہم نے زخم پہنائے بھی تھے
میرے ہی دُکھ کہکشاں در کہکشاں
غمگساروں نے تو اپنے پنکھ پھیلائے بھی تھے
اپنی تنہائی کا غم اُن پر کھلے اور کیوں کھلے
احتیاطاً بزم میں ہم لوگ مسکائے بھی تھے
دل ہی یہ کم بخت تھا عابدؔ کہ نا اُن پر کھلا
ہم وہاں پہنچے بھی تھے اور وہ یہاں آئے بھی تھے

## محمد اشرف کمال

کر لیا ہے فیصلہ کہنا اُسے
اب نہ ہوگا رابطہ کہنا اُسے
سامنا ہوجائے محفل میں اگر
غور سے مت دیکھنا کہنا اُسے
جس پہ ہم چلتے رہے ہیں ساتھ سات
کھو گیا وہ راستہ کہنا اُسے
تیری یادیں دل سے رُخصت ہوگئیں
ہو چکا یہ سانحہ کہنا اُسے
اب نہ دیکھے گا تمہارا راستہ
دل کو میں سمجھا چکا کہنا اُسے
زندگی بھر ب نہ مل پائیں گے ہم
بڑھ گیا ہے فاصلہ کہنا اُسے
چین سے سونے نہ دے گا غم تجھے
رات بھر اب جاگنا کہنا اُسے
آشنا بن کے نہ ملنا راہ میں
دوستی اک خواب تھا کہنا اُسے
مڑ کے پیچھے دیکھتے ہم بھی نہیں
سوچ کر منہ پھیرنا کہنا اُسے

## ایم زیڈ کنول

ہونٹوں پہ تیرے پیار کے نغمے سجائے ہیں
دل میں عقیدتوں کے سمندر بسائے ہیں
وہ گلبدن جو آج بھی مذکور تک نہیں
اس کے بدن کی راکھ نے موتی لٹائے ہیں
سارے مغالطات کو خوشبو میں ڈھال کر
جھیلوں نے آنگنوں میں کنول ہی بسائے ہیں
جھیلوں کے آنگنوں میں کنول مسکرائے ہیں

## قرآن کے پاروں میں

مبشر شہزاد، گلاسگو، سکاٹ لینڈ

پیغام اطاعت ہے قرآن کے پاروں میں
تلقین عبادت ہے قرآن کے پاروں میں

مضمون ہدایت ہے قرآن کے پاروں میں
گنجینۂ حکمت ہے قرآن کے پاروں میں

سب شان خدائی کی آتی ہے نظر ان میں
تنویر بصیرت ہے قرآن کے پاروں میں

تحریر ہے بخشش کا وعدہ بھی گنہگارو!
اللہ کی رحمت ہے قرآن کے پاروں میں

قانون ہے کیا آخر اسلام کا یہ جانو
تفصیلِ شریعت ہے قرآن کے پاروں میں

ہے ذکر پیمبرؐ کا اسلام کے رہبرؐ کا
اعلانِ رسالت ہے قرآن کے پاروں میں

ہیں نوحؑ بھی موسیٰؑ بھی، عیسیٰؑ بھی ہیں یحییٰؑ بھی
نبیوں کی حکایت ہے قرآن کے پاروں میں

بیزار نہ ہو کیونکر خود کفر سے ہر قاری
ایمان کی دولت ہے قرآن کے پاروں میں

صالح ہیں مبشرؔ جو دنیا میں فقط اُن کو
جنت کی بشارت ہے قرآن کے پاروں میں

## دُعا راجپوت

یہ رَنج و بلا کا خوف نہ کر یہ نام نہ لے آزادی کا
جب ولولہ پرواز نہیں الزام نہ لے آزادی کا
آزادی کو تلواروں کی آغوش میں پالا جاتا ہے
آبادی کو بربادی کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے
میدانِ وفا میں جینے کا ارمان نکالا جاتا ہے
غیرت کے سنہرے پرچم کو سر دے کے سنبھال جاتا ہے
یا فلسفہ لا تحزن کی تاویل نہ کر شمشیر اُٹھا
یہ اپنے سرِ ناکارہ سے یہ تہمت داروگیر اُٹھا
دریائے سکون و راحت میں طوفان ہزاروں آئیں گے
ہستی کے مسرت خانون پر تیغوں کے الم لہرائیں گے
ماں باپ کی آنکھوں کے آگے اولاد کے سر کٹ جائیں گے
ارباب وطن کے سینوں میں دل لرزیں گے تھرائیں گے
گم ہوں گے کتابِ ہستی سے ایمان و وفا کے افسانے
خود شمع بجھانے کی خاطر یلغار کریں گے پروانے۔
گڑھ جائے گا سینوں میں پرچم خنجر کی چمکتی دھاروں کا
پی پی کے لہو انسانوں کا متلائے گا جی تلواروں کا
پرسان الم ہو گا نہ کوئی مردوں کے سِوا بیماروں کا
چھپ جاینگے ڈر کر شمس و قمر روخ زرد پڑے گا تاروں کا
ہر گام پہ توپیں گرجیں گی ہر بام پہ گولے برسیں گے
ہر شاخ جلا دی جائے گی ہر نخل پہ اولے برسیں گے
بڑھنا ہے اگر اِس میداں میں ہر غم کو بھلا کے آگے بڑھ
ایمان و یقین کو قسمت کی تحریر بنا کر آگے بڑھ
آہنگِ نفس سے غلغلۂ تکبیر اُٹھا کے آگے پڑھ
اپنے ہی دھڑکتے سینے پر اک زخم لگا کر آگے بڑھ
وہ نعرہ لگا تو میداں میں شیروں کے بھی سینے پھٹ جائیں
ہر جنبش چشم ابرو سے شیطان کے لشکر کٹ جائیں
مانا کے بساطِ عالم پر مجبور ہے تو لاچار ہے تو
باطل کے عساکر کے آگے ٹوٹی ہوئی اک تلوار ہے تو
آباد ہیں وہ برباد ہے تو زردار ہیں وہ نادار ہے تو
وہ روئے زمین کے مالک ہیں اور دوشِ زمین پر بار ہے تو
لیکن یہ جہاں سب تیرا ہے تاریخ سلف دہراتا چل
ایمان و عمل کے پربط پر اسلام کا نغم گاتا چل



## سراج اورنگ آبادی

خبرِ تحیّرِ عشق سُن، نہ جنُوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سَمتِ غیب سِیں اِک ہوا، کہ چمن سرُور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دِل کہیں وہ ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گِلہ کِس زباں سے کروں بھلا
کہ شرابِ صدقدح آرزُو خُمِ دِل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لِیا درس نُسخہِ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیُوں دھری تھی تیُوں دھری رہی
تِرے جوشِ حیرتِ حُسن کا اثر اِس طرح سِیں عیاں ہُوا
کہ نہ آئینے میں جِلا رہی، نہ پری کُوں جلوہ گری رہی
کِیا خاک آتشِ عشق نے دِلِ بے نوائے سراؔج کُوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

## قاسم مقصود۔انتخاب: نوید مرزا

چلو آؤ رکھ دیں اناؤں کو کسی اجنبی سی منڈیر پر
درِ یار عشق کو روک لیں پسِ پشت رکھ دیں خطاؤں کو
چلو آؤ باندھ لیں ہجر کو غمِ دلبری کے مقام سے
جہاں بات ہو مرے عشق کی پسِ مرگ رکھ دیں جفاؤں کو
چلو آؤ یاد کی دھند کو یوں بکھیریں اپنے وجود پر
کریں یاد چہرہ وہ دلربا کریں یاد اس کی وفاؤں کو
چلو آؤ وصل کی ناؤ پر کوئی راگ چھیڑیں خلوص کا
کوئی ٹھمری گائیں سرور کی کوئی نغمہ چھیڑیں عطاؤں کا
چلو آؤ رقص میں ڈوب کر کسی ناخدا کو پکار لیں
چلو آؤ مانگ لیں ساحری جو عروج بخشے دُعاؤں کو

## پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد

الگ الگ سہی مگر کبھی کبھی باہم بھی ہیں
مسرتوں کے ساتھ ساتھ کچھ غم و الم بھی ہیں
کہاں بھلائے بھولتی ہے دُھوپ چھاؤں زندگی
نوازشِ کرم تو ہے مگر تیرے ستم بھی ہیں
جنوں شعار زندگی بری بھلی گزر گئی
مگر یہ سوچتے ہیں ہم کہیں کہیں تو ہم بھی ہیں
وہیں جبیں کو رکھ دیا جہاں ذرا گماں ہوا
کہ اس شکستِ خاک میں کہیں تیرے قدم بھی ہیں
میں کس زمانے کے غم نصیبوں کی خاک پر ہوں کھڑا ہوا
میرے سر سے گزر گیا ہے لہو کا دریا چڑھا ہوا
مجھے کسی نے بتادیا ہے نشان ترے وجود کا
اسی لئے تو میں آج بھی ہوں یقینِ دل پہ اَڑا ہوا
یہ زندگی تو گزار دی ہے اُس آستاں پر پڑے ہوئے
مگر میں ہرگز نہیں ہوں ایسا کہ تھک گیا ہوں پڑا ہوا
کرو محبت ہر ایک سے تم کسی سے نفرت کبھی نہیں
یہی وہ قولِ کمال ہے جو درونِ دل میں گڑھا ہوا
یہ عظمتیں بھی اسی کی ہیں یہ محبتیں بھی اسی کی ہیں
کہ اِس زمانے میں اُس سے بڑھ کر کہاں پہ کوئی بڑا ہو

## آفتاب شاہ

ایسا لگتا ہے برا ہوں ہیں مرے یار غلط
جھوٹ ہے عشق و محبت ہے مرا پیار غلط
دنیا بیکار ہے ہیں ارض و سما، بھی جھوٹے
شیخ بھی جھوٹا ہے ہے ملا بھی مکار غلط
جذبے جھوٹے ہیں سبھی رشتے بھی جھوٹے سارے
لفظ جھوٹے ہیں تو ہیں جملے بھی بے کار غلط
باتیں جھوٹی ہیں تو ہے وعدے بھی جھوٹے سارے
قسمیں جھوٹی ہیں سبھی عشق کے اذکار غلط
عقل جھوٹی ہے تو ہیں خواب بھی جھوٹے سارے
راہیں جھوٹی ہیں سبھی اور دلِ بے زار غلط
ہجر جھوٹا ہے تو ہے وصل بھی مجرم جیسا
زخم جھوٹے ہیں سبھی اور ترا اظہار غلط
بکتے استاد بھی ہیں جھوٹے ہیں افکار سبھی
جھوٹے ہیں علم کے طالب سبھی کردار غلط
ملنا جھوٹا ہے تو ہے جھوٹ بچھڑنا یارو
جھوٹے پیمان ہیں اور ان کا ہے پرچار غلط
جھوٹا بچپن ہے تو ہے دورِ جوانی جھوٹا
پیری جھوٹی ہے تو ہیں یہ سبھی ادوار غلط

## آفتاب شاہ

میں قتیل ہوں میں فراز ہوں میں تو اپنے عہد کا خواب ہوں
میں تو میر ہوں میں نظیر ہوں میں ادب پہ رکھا گلاب ہوں
میں ارسطو ہوں میں ہی نقد ہوں میں ادب پہ اترا شہاب ہوں
جو قلم کو رکھتا ہے تیغ تر مجھے ملیے میں وہ عُقاب ہوں
میں ادیب ہوں میں نقیب ہوں میں ادب پہ رکھی صلیب ہوں
میں ہی حرف ہوں میں ہی لفظ بھی میں ادب پہ اتری کتاب ہوں
مجھے دسترس ہے علوم پر مرا حرف حرف ہے مستند
میں ہوں بحر و بر کا عروض داں میں غزل کا سچا شباب ہوں
نا میں حافی ہوں نا اضافی ہوں میں اسیرِ میر کا پیر ہوں
جسے یاد ہے وہ زرا زرا میں اسی کا اترا نقاب ہوں
میں رواج ہوں کسی دور کا میں یقینِ پختہ کا راز ہوں
میں فصیلِ نظم ہوں آج کی میں سخن گری کا نقاب ہوں
میں کمال ہوں میں جمال ہوں میں وجودِ فیض کا روپ ہوں
میں فقیرِ عشق کی راہ ہوں میں خودی میں لپٹا سحاب ہوں

# آغا نیاز مگسی

## مینا کماری ناز کی شاعری

برصغیر کی ایک بے مثال و باکمال اداکارہ اور شاعرہ مینا کماری یکم اگست 1933 میں پیدا ہوئیں۔ان کا اصل نام ماہ جبین، فلمی نام مینا کماری اور تخلص ناز تھا۔ان کی والدہ کا نام پربھاوتی تھا۔ وہ ایک عیسائی بنگالی خاتون تھیں۔ مینا کماری کے والد صاحب کا نام علی بخش تھا۔ وہ ایک تھیٹر آرٹسٹ، نغمہ نگار اور موسیقار تھے۔ پربھاوتی ایک رقاصہ تھی جس نے ماسٹر علی بخش سے شادی کی اور اسلام قبول کر کے مسلمان ہوگئی جس کا اسلامی نام اقبال بیگم رکھا گیا۔ مینا کماری اقبال بیگم اور ماسٹر علی بخش کی بیٹی تھیں۔ مینا کماری نے فلموں میں لازوال کردار ادا کیا اور خوبصورت شاعری کی انہوں نے 14 فروری 1954 میں کمال امروہوی سے شادی کی۔ مینا کماری کو اولاد نہیں ہوئی۔ 31 مارچ 1972 باکمال اداکارہ اور شاعرہ مینا کماری ناز صاحبہ کی وفات ہوگئی۔

### مینا کماری

تیری عنایتوں کا انداز جداگانہ
کبھی رو پڑے مقدر، کبھی ہنس پڑا زمانہ

***

تیری آواز میں تارے سے کیوں چمکنے لگے
کس کی آنکھوں کے ترنم کو چُرا لائی ہے
کس کی آغوش کی ٹھنڈک پہ ڈاکہ ڈالا ہے
کس کی بانہوں سے تو شبنم کو اُٹھا لائی ہے

***

ہاں کوئی اور ہو گا تو نے جو دیکھا ہو گا
ہم نہیں آگ سے بچ بچ کے گزرنے والے

***

نہ انتظار، نہ آہٹ، نہ تمنا، نہ امید
زندگی ہے کہ یوں بے حس ہوئی جاتی ہے

***

سنبھلتا نہیں دل کسی بھی طرح
محبت کی ہائے تباہ کاریاں

***

شمع ہوں، پھول ہوں یا ریت پہ قدموں کا نشاں
آپ کو حق ہے مجھے جو بھی چاہے کہہ لیں

***

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا
ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا

***

آغاز تو ہوتا ہے انجام نہیں ہوتا
جب میری کہانی میں وہ نام نہیں ہوتا

***

عیادت ہوتی جاتی ہے عبادت ہوتی جاتی ہے
مرے مرنے کی دیکھو سب کو عادت ہوتی جاتی ہے

***

کہیں کہیں کوئی تارہ کہیں کہیں جگنو
جو میری رات تھی وہ آپ کا سویرا ہے

***

یوں تیری رہ گزر سے دیوانہ وار گزرے
کاندھے پہ اپنے رکھ کے اپنا مزار گزرے
بیٹھے ہیں راستے میں دل کا کھنڈر سجا کر
شاید اسی طرف سے اک دن بہار گزرے
دار و رسن سے دل تک سب راستے ادھورے
جو ایک بار گزرے وہ بار بار گزرے
بہتی ہوئی یہ ندیا گھلتے ہوئے کنارے
کوئی تو پار اترے کوئی تو پار گزرے
مسجد کے زیر سایہ بیٹھے تو تھک تھکا کر
بولا ہر اک منارہ تجھ سے ہزار گزرے
قربان اس نظر پہ مریم کی سادگی بھی
سائے سے جس نظر کے سو کردگار گزرے
تو نے بھی ہم کو دیکھا ہم نے بھی تجھ کو دیکھا
تو دل ہی ہار گزرا ہم جان ہار گزرے

***

جب چاہا اقرار کیا ہے جب چاہا انکار کیا
دیکھو ہم نے خود ہی سے یہ کیسا انوکھا پیار کیا
ایسا انوکھا ایسا تیکھا جس کو کوئی سہہ نہ سکے
ہم سمجھے پتی پتی کو ہم نے ہی سرشار کیا
روپ انوکھے میرے ہیں اور روپ یہ تو نے دیکھے ہیں
میں نے چاہا کر بھی دکھایا یا جنگل گلزار کیا
درد تو ہوتا ہی رہتا ہے درد کے دن ہی پیارے ہیں
جیسے تیز چھری کو ہم نے رہ رہ کر پھر دھار کیا
کالے چہرے کالی خوشبو سب کو ہم نے دیکھا ہے
اپنی آنکھوں سے ان کو شرمندہ ہر اک بار کیا
روتے دل ہنستے چہروں کو کوئی بھی نہ دیکھ سکا
آنسو پی لینے کا وعدہ ہاں سب نے ہر بار کیا
کہنے جیسی بات نہیں ہے بات تو بالکل سادہ ہے
دل ہی پر قربان ہوئے اور دل ہی کو بیمار کیا
شیشے ٹوٹے یا دل ٹوٹے خشک لبوں پر موت لئے
جو کوئی بھی کر نہ سکا وہ ہم نے آخر کار کیا
ناز ترے زخمی ہاتھوں نے جو بھی کیا اچھا ہی کیا
تو نے سب کی مانگ سجائی ہر اک کا سنگار کیا

***

آغاز تو ہوتا ہے انجام نہیں ہوتا
جب میری کہانی میں وہ نام نہیں ہوتا
جب زلف کی کالک میں گھل جائے کوئی راہی
بدنام سہی لیکن گمنام نہیں ہوتا
ہنس ہنس کے جواں دل کے ہم کیوں نہ چنیں ٹکڑے
ہر شخص کی قسمت میں انعام نہیں ہوتا
دل توڑ دیا اس نے یہ کہہ کے نگاہوں سے
پتھر سے جو ٹکرائے وہ جام نہیں ہوتا
دن ڈوبے ہے یا ڈوبی بارات لیے کشتی
ساحل پہ مگر کوئی کہرام نہیں ہوتا

***

عیادت ہوتی جاتی ہے عبادت ہوتی جاتی ہے
میرے مرنے کی دیکھو سب کو عادت ہوتی جاتی ہے
نمی سی آنکھ میں اور ہونٹ بھی بھیگے ہوئے سے ہیں
یہ بھیگا پن ہی دیکھو مسکراہٹ ہوتی جاتی ہے
تیرے قدموں کی آہٹ کو ہے دل یہ ڈھونڈھتا ہر دم
ہر اک آواز پہ اک تھرتھراہٹ ہوتی جاتی ہے
یہ کیسی یاس ہے رونے کی بھی اور مسکرانے کی
یہ کیسا درد ہے کہ جھنجھناہٹ ہوتی جاتی ہے
کبھی تو خوبصورت اپنی ہی آنکھوں میں ایسے تھے
کسی غم خانہ سے گویا محبت ہوتی جاتی ہے
خود ہی کو تیز ناخونوں سے ہائے نوچتے ہیں اب
ہمیں اللہ خود سے کیسی الفت ہوتی جاتی ہے
اے میرے اجنبی تو چلا جائے گا
وقت آنسو ہی آنسو میں ڈھل جائے گا
وقت آہوں میں میری بدل جائے گا
وقت یادوں سے تیری بہل جائے گا
جسم لاوے کی صورت پگھل جائے گا
ذہن پارے کی صورت پھسل جائے گا
اے میرے اجنبی تو چلا جائے گا

## سلیم کوثر

تم نے سچ بولنے کی جرات کی
یہ بھی توہین ہے، عدالت کی
منزلیں راستوں کی دھول ہوئیں
پوچھتے کیا ہو تم، مسافت کی
اپنا زادِ سفر بھی، چھوڑ گئے
جانے والوں نے کتنی عجلت کی
میں جہاں قتل ہو رہا ہوں وہاں
میرے اجداد نے، حکومت کی
پہلے مجھ سے جدا ہوا اور پھر
عکس نے، آئینے سے ہجرت کی
میری آنکھوں پہ اس نے ہاتھ رکھا
اور اک خواب کی، مہورت کی
اتنا مشکل نہیں، تجھے پانا
اک گھڑی چاہئے ہے فرصت کی
ہم نے تو، خود سے انتقام لیا
تم نے کیا سوچ کر محبت کی
کون، کس کے لیے تباہ ہوا؟
کیا ضرورت ہے اس وضاحت کی
عشق جس سے نہ ہو سکا ، اس نے
شاعری میں، عجب سیاست کی
یاد آئی تو ہوئی شناخت، مگر
انتہا ہو گئی ہے، غفلت کی
ہم وہاں، پہلے رہ چکے ہیں سلیم
تم نے جس دل میں اب سکونت کی

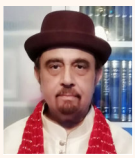

## ڈاکٹر منورؔ احمد کنڈے

### عبدالستار ایدھی کی رحلت پر

آسماں سے تُو تھا آیا چل دیا واپس وہیں
اب زمیں والوں کو تجھ سا مل نہیں سکتا کہیں
مر کے بھی زندہ ہے تُو کہ ہو کوئی جیسے شہید
جنتوں کے سب فرشتے کر رہے ہیں تیری دید
کون آیا ہے اِرم میں یہ محبت کا سفیر
جس کی خاطر رو رہے ہیں دھرت پر سب طفل و پیر
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا عبدالستار
چہرے سب کے آنسوؤں سے دھو گیا عبدالستار
آسمانوں کی بلندی چھُو گیا عبدالستار
رحمتوں کی جنتوں میں کھو گیا عبدالستار
بادشاہ تُو امن کا لیکن فقیروں میں شمار
ہیں وزیر و صدر و مُلّا تیرے مثلِ خاکسار
تم کو کِتنوں نے دکھائے حکمرانی کے سمند
تُو سیاست میں نہ الجھا تھی بصیرت بھی بلند
تُو نے اپنائی جہاں میں جو تھی راہِ مستقیم
تیرے جانے پر سمجھتی قوم ہے خود کو یتیم
تجھ سے الفت تھی جہاں والوں کو تیرے کام سے
لمحے تیری زندگی کے دہر کے خدام تھے
اب کہاں تجھ سا ملے گا اس جہاں کو خاک سار
آنکھ سے بیوہ کی پونچھے کون اب اشکِ نزار
بے سہاروں کا سہارا تجھ کو کہتے ہیں سبھی
تیرے جیسا قوم نے پایا نہیں پہلے سخی
مل گئی خوش بخت کو ہے چشم تیرے نام کی
تیری آنکھیں آج بھی نگران تیرے کام کی
اے منورؔ درد کے صحرا کا سیرابی تھا وہ
تشنگی سے پُر زمیں کے واسطے آبی تھا وہ

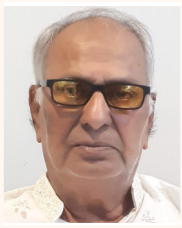

# کرامت راج ایک ادبی شخصیت

## میں ہوں صدائے قلب، محبت ہے میرا نام

صفی اللہ راجپوت،
ملٹن، کینیڈا

قدرت نے ایک بے قرار رُوح کو قلندوں کا مزاج، درویشوں کا غناء اور شاعرانہ تخیل دے کر جس پیکرِ خاکی میں جلوہ گر کیا اسے گھر والوں نے کرامت اللہ، علمی دنیا نے پروفیسر کرامت راجپوت اور حلقہ بزم وسخن نے کے۔راجؔ کے نام سے موسوم کیا۔ کرامت اللہ راجپوت صاحب، پیدائش فروری ۱۹۶۴ء کراچی، چوہدری عظمت اللہ راجپوت و محترمہ مقبول جان صاحبہ کی پانچویں اولاد تھے۔ کرامت اللہ راجپوت نے ابتدائی تعلیم کراچی میں ہی حاصل کی اور ۱۹۵۵ میں، ون یونٹ کے قانون کے باعث، اپنے والد صاحب، جو وفاقی سیکریٹیریٹ میں سرکاری ملازم تھے، کے لاہور تبادلہ کے بعد، باقی تعلیم لاہور میں ہی مکمل کی۔ آپ نے ۱۹۶۶ میں جامعہ پنجاب سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور حصولِ روزگار کے لئے کراچی آ گئے۔ آپ نے کراچی میں ۵۵ سال کا طویل عرصہ گزارا۔ ۲۰۱۶ میں آپ کینیڈا منتقل ہوئے اور مارچ ۲۰۲۲ میں اپنے انتقال کے وقت تک مِلٹن اونٹاریو میں رہائش پذیر رہے۔ ابا جان مرحوم ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ آپ ایک سعادت مند بیٹے، خبر گیر بھائی، مثالی شوہر، مشفق باپ، باوصف استاد، با کمال شاعر اور باوفا دوست تھے۔ آپ ایک خوددار، با مروت، دیانت دار، اصول پسند، قانع اور نافع الناس وجود تھے۔ ساری عمر رزقِ حلال کمایا، کوئی جائیداد تو نہیں بنائی لیکن ورثہ میں ایک علمی اور درویشانہ میراث چھوڑ گئے، اب جس کی امین اُن کی روحانی و جسمانی اولاد ہے۔ درس و تدریس محض آپ کا پیشہ نہیں، محبت و عبادت تھی۔ اپنے شاگردوں سے آپ کا قلبی تعلق تھا اور اُن کے لئے ہمہ وقت میسر ہوتے۔ آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں جو آج اپنے اپنے شعبوں میں کامیاب ہیں اور اپنی کامیابی کی کلید پروفیسر کرامت راجپوت کو ہی جانتے ہیں۔ اِس بات کی گواہی سیکڑوں جاننے والے دیں گے کہ ہمارے گھر میں مہمانوں والا کمرہ ہمہ وقت اُن کے شاگردوں سے ہی بھرا رہتا تھا۔ وہ محض ایک استاد نہیں تھے بلکہ ایک دوست، ہمدرد اور رہبر ایک انجمن تھے۔ میں کئی ان کے ایسے شاگردوں کو جانتا ہوں جن کے داخلہ کی فیس بھی آپ نے ادا کی، پڑھایا بھی خود ہی، امتحانی فیس بھی دی اور پھر نوکری تک کی کوششیں ایسے کیں جیسے کوئی اپنی سگی اولاد کے لئے کرتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک کشش تھی جس کی وجہ اُن کا اخلاص تھا، جس بھی کام کا بیڑہ اُٹھاتے، اُس میں جُت جاتے اور کام مکمل کر کے ہی دم لیتے تھے۔ یہ حیرت کی بات نہیں کہ اُن کے شاگردوں میں سے ایک وزیرِ اعظم پاکستان بھی ہوا اور کئی ایسے ہیں جو سول سروس میں کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹرز اور انجینئرز کا تو شمار ہی ممکن نہیں۔ آپ کی علمی زندگی کی معراج وہ وقت تھا جب ۱۹۹۸ میں آپ کو اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی کا ناظم الامتحانات مقرر کیا گیا۔ یہ ایک کلیدی عہدہ تھا اور مخلص ہونے کی وجہ سے اِس تعنیاتی کی شدید مخالفت کی گئی۔ شاید ہی کوئی ایسا اخبار تھا جس میں آپ کے خلاف خبر نا لگی ہو۔ آپ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور تین ماہ کی قلیل مدت میں تمام امتحانات کروائے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق، اُس سال تقریباً تین لاکھ کے قریب طلباء اعلیٰ ثانوی امتحانات میں شریک ہوئے۔ آپ نے ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ امتحانات کے نتائج انٹرنیٹ پر دیئے جو ۱۹۹۸ میں ایک آسان کام نہیں تھا۔ آپ کی خودداری، رزقِ حلال کمانے کی لگن اور شہرِ کراچی کی سیاسی صورتِ حال آپ کے عہدہ پر رہنے کے حق میں نا تھی، اسی وجہ سے نتائج کے اعلان کے بعد آپ نے اس عہدہ سے استعفیٰ دیا اور درس و تدریس کی طرف واپس آ گئے۔ آپ نے ۲۰۰۶ میں منگھو پیر ڈگری کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹارمنٹ لی لیکن کسی نہ کسی صورت میں ۲۰۱۶ تک درس و تدریس سے منسلک رہے۔

شاعری آپ کی روح تھی۔ آپ نے نوجوانی سے ہی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ آپ کی بڑی ہمشیرہ محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ منیرؔ صاحبہ بھی صفِ اول کی شاعرہ تھیں۔ اپنی شاعری کے متعلق ابا جان بتاتے تھے کہ ۱۹۷۰ء کے عشرہ سے مشاعروں میں شامل ہوئے، اوّل اوّل آپ نے ثاقب زیروی صاحب کی زیرِ مدارت ہفت روزہ لاہور میں اپنی غزلیں بھجوانا شروع کیں تو زیروی صاحب نے کمال شفقت سے نا صرف حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ اصرار کے ساتھ تازہ کلام کی فرمائش بھی کرتے رہتے۔ ۱۹۷۰ تا ۱۹۷۹ تک آپ

باقاعدگی سے مشاعروں میں شرکت کرتے، جوش ملیح آبادی، عبیداللہ علیمؔ، سلیم کوثرؔ، شبنم رومانیؔ، حمایت علی شاعر اور صابر ظفرؔ جیسے نام ور شعراء سے ذاتی دوستی تھی اور اکثر ان احباب کو مشاعروں میں لے کر جانا اور واپس لانے کی ذمہ داری بھی نہایت محبت سے انجام دیتے۔ آپ کی شاعری میں جماعت اور خلافت سے محبت و وارفتگی فطری تھی۔ ۱۹۹۱ میں جب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع دارالایمان تشریف لائے تو جلسہ سالانہ کے ایام میں دارالایمان میں ہونے والے مشاعرہ کی صدارت کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا جب کہ مہمانِ خصوصی مکرم حافظ مظفر احمد صاحب تھے۔ اس موقع پر جلسہ کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس میں آپ کو اپنی مشہور غزل تجدیدِ عہد ترنم کے ساتھ سنانے کا موقع ملا اور شرکا جلسہ کو بے اختیار ثاقب زیروی صاحب یاد آ گئے۔ اُس غزل کے چند اشعار یہ تھے۔

کئے ہیں تُجھ سے جو عہدو پیماں ہمارے دل میں جواں رہیں گے
زمانہ کِتنے سِتم ہی ڈھائے ترے رہیں گے جہاں رہیں گے
چراغ ہم نے لہو سے اپنے قدم قدم پہ جلا دیئے ہیں
جُنوں کے صحرا میں کہکشاں سے ان آبلوں کے نشاں رہیں گے
کبھی جو مقتل بھی راہ میں تھا نا ہم رُکے تھے نا رُک سکیں گے
یہ قافِلے ہیں صداقتوں کے یہ سوئے منزل رواں رہیں گے
اُٹھیں گے گر چہ اُدھر سے طُوفاں رقابتوں کے اذیتوں کے
اِدھر بھی لیکن یقین و ایماں سِپر رہے ہیں سِناں رہیں گے
ہماری چاہت نا چُھپ سکی ہے، ہمارے جذبے نا چُھپ سکیں گے
جو ضبطِ غم سے نہ لب ہلیں گے تو اشک بنکر عیاں رہیں گے
قسم ہے تیری اَے جانِ جاناں یہ جاں امانت ترے لئے ہے
ابھی چُکا دیہ قرض جاں کا، نہ جانے کل تک کہاں رہیں گے

اِسی طرح ۱۹۸۸ میں بھی دارالایماں ہی میں جلسہ سالانہ میں پڑھی گئی یہ غزل بھی بہت مقبول ہوئی۔

ہے کاروانِ عِشق ازل سے رواں دواں
باطِل کے کوہسار ابد تک دھواں دھواں
پروانے سجدہ ریز ہیں ابتک وہاں وہاں
روشن تری لہو سے ہیں شمعیں جہاں جہاں
لالے کا سوز، رنگِ شفق، سُرخیء حنا
پہنچے ترے لہو کے شرارے کہاں کہاں
نہرِ فرات اپنے مقدر پہ خندہ زن
جذبِ حسین تِشنہ لبی میں جواں جواں
ظُلمت کدوں کو تونے زمیں بوس کردیا
تیری جبیں سے نور کی کِرنیں عیاں عیاں

آپ کی دارالایمان کی محبت میں کہی گئی نظم وہ دارالایمان کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں! تو زبان زدِ خاص وعام ہیں اور اسی نظم سے آپ کو جہاں گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اِس نظم کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

وہ دارالایمان کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں!
خدا کرے ہمیں ملیں، جہاں کہیں بھی ہم رہیں
ہر اک طرف سے کارواں، تھے سوئے دارالایمان رواں
ہر ایک طفل و مرد و زن کشاں کشاں، جواں جواں
قدم قدم تھے ضوفشاں، مسیح وقت کے نشاں
''بڑھے چلو، بڑھے چلو'' یہ کہہ رہی تھیں دھڑکنیں
وہ دارالایمان کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں!
خدا کرے ہمیں ملیں، جہاں کہیں بھی ہم رہیں
طبیعتوں میں اک الگ، عجیب سا نکھار تھا
آرزو تھی مضطرب، ہر ایک دل میں پیار تھا
نفس نفس تھا مطمئن ہر اک طرف قرار تھا
جبیں جبیں تھی سجدہ ریز، برس رہی تھیں رحمتیں
وہ دارلایمان کی رونقیں! وہ کُو بکُو محبتیں!
خدا کرے ہمیں ملیں، جہاں کہیں بھی ہم رہیں

سال ۲۰۲۱ کے اُوائل میں آپ کو جگر کا عارضہ لاحق ہوا تو صحت گرنی شروع ہوئی لیکن آپ کے مشاغل میں کوئی فرق نا آیا۔ آپ معمول کے مطابق والدہ کو ڈائیلیسز کے لئے لے کر جاتے اور اپنے حلقہ احباب کے ساتھ تعلق قائم رکھتے۔ صحت کی بتدریج گراوٹ کی وجہ سے آخری چند ہفتوں میں نقاہت و کمزوری بڑھتی گئی اور ۳۰ مارچ کو اسپتال میں مختصر علالت کے بعد دائی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آج جب اُن کی زیرِ تکمیل مجموعہ کلام 'دارورسن' کو دیکھ رہا تھا، اور ۱۹۷۲ کی لکھی ایک غزل سامنے آئی تو یوں لگا جیسے اُن کی زندگی کا نچوڑ اور خلاصہ ہو۔ اسی غزل پر اپنے پیارے والد صاحب کا ذکرِ خیر مکمل اس دُعا کے ساتھ

مکمل کرتا ہوں، حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا!

ہر گام پر دیا سا جلاتا چلا گیا
یُوں شامِ غم کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
میں ہوں صدائے قلب، محبت ہے میرا نام
میں دِل کو دِل کی بات سُناتا چلا گیا
دینے کو میرے پاس فقط ایک جام تھا
میں قطرہ قطرہ سب کو پلاتا چلا گیا
دستِ دُعا تھا کوئی مرے ساتھ اِس طرح
سوئے نصیب جو کہ جگاتا چلا گیا
دُشمن نہیں ہے کوئی مرا، سُن میرے رفیق
رُوٹھے ہُووں کو روز مناتا چلا گیا
پہنچا دیارِ عِشق میں مَیں اسطرح ندیم
میں آگ نفرتوں کی بُجھاتا چلا گیا



## سوہن راہی

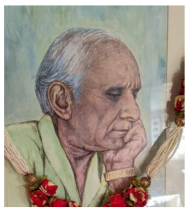

سمے کا بادل اُڑتا جائے
پرچھائی پرچھائی انساں کرے ہے کیوں
ابھی مان کہو کیوں
کرے ہے یہ ابھان جگت میں جھوٹھی اس کی شان
سانجھ سویرے رُوپ سجا کر جاوت ہیں کت چھور
سبھی دشائیں موت کا تانڈو۔آگ بھی چھوں
ورنیل محل کی پون جھیل میں
سب کی اک پہچان، کہو کیوں سب کی اک پہچان،
اُلٹی گنتی کرتے کرتے، سانس اُکھڑتی جائے،
سورج کی کرنوں سے لیسے دھو بچھڑتی جائے
آئیو کجری رُکتی جائے
ٹوٹی جائے تان، کہو کیوں ٹوٹی جائے تان
گاتے گاتے چپ ہو جائے، رنگ روپ کا جھرما
کس پل کہاں ٹوٹ کے بکھرے، جیون بیت کا سپنا
رنگ بدلتے، جگ منڑ پر،
راہی کرے ہے مان، کہو کیوں راہی کرے ہے مان

# بلقیس ایدھی ''پاکستان کی ماں'' کا انتقال پر ملال

**امجد مرزا امجدؔ**

دنیا میں کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں خدا صرف اپنی مخلوق کی خدمت کے لئے پیدا کرتا ہے۔ پاکستان میں سرفہرست عبدالستار ایدھی تھے اور پھر ان کی بیگم بلقیس ایدھی ۔جو 15اپریل 2022 کو کراچی میں وفات پا گئیں اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں لاکھوں کی دعاؤں کے ساتھ کراچی ہی میں دفن کی گئیں۔ انا للہِ و انا الیہ راجعون۔

اللہ پاک ان کو غریق رحمت کرے۔کون نہیں جانتا کہ پاکستان میں جو جو کام ایدھی فاؤنڈیشن نے کئے اور کررہے ہیں وہ آج تک کسی حکومت کو بھی کرنے کی توفیق نہ ملی۔بلقیس ایدھی ایک پروفیشنل نرس تھیں اور ایدھی صاحب کے ساتھ کچھ مدت رضا کارنہ کام کیا اور اس کے بعد ان سے شادی کرلی۔اور اپنی زندگی انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کردی۔آپ کی اولاد میں سے فیصل ایدھی، کبرا ایدھی،کوتب ایدھی اور الماس ایدھی ہیں۔ آپ کی طویل انسانی خدمات کے عوض بے شمار ایوارڈ دیئے گئے جن میں پاکستان حکومتی ایوارڈ ہلالِ امتیاز بھی دیا گیا۔اور ایک اہم ایوارڈ لینن پیس ایوارڈ بھی ملا۔آپ کو''پاکستان کی ماں'' کہا جاتا تھا۔آپ ایدھی فاؤنڈیشن کی ''کو چیئر'' بھی تھیں۔آپ کیپیدائش بانٹوا انڈیا میں 14اگست 1947 میں ہوئی۔جب پاکستان وجود میں آیا۔کس قدر خوش نصیب خاتون تھی کہ جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا اس کی خدمت کے لئے اللہ پاک نے بلقیس کا پیدا کیا۔کیسا اتفاق ہے یہ بھی۔اور پھر اس عظیم خاتون نے اس پاک وطن کے غریب نادار یتیم بے کس لوگوں کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔اللہ پاک ان کو اوران کے خاوند عبدالستار ایدھی کو جنت کے اعلیٰ درجات نصیب کرے۔ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو ایک ایسی تاریخ اپنے خون پسینے سے رقم کرجاتے ہیں جو صدیوں زندہ رہتی ہے۔ دنیا سے اوجھل ہوکر بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔کیا قابلِ مثال تھے وہ لوگ۔

# آہ کوثر علی!

امجد مرزا امجدؔ

پچھلے دنوں لندن کے معروف شاعر ڈرامہ نگار، ڈرامہ ڈایئریکٹر رفعت شمیم صاحب نے بتایا کہ محترمہ کوثر علی انتقال کر گئی ہیں۔ بہت دکھ ہوا کہ آپ نہایت خاموش طبع مخلص معروف ڈرامہ نگار جن کی ایک کتاب ''آئینہ حیات'' شائع ہو چکی ہیں۔آپ اسکول کے بچوں کے لئے ڈرامہ لکھتی تھیں اور ان کے بے شمار ڈرامے ان کے اسکول کے بچوں نے اسٹیج بھی کئے۔ مجھے افسوس اس بات پر بھی ہوا کہ آپ کا انتقال کو ایک دو ماہ ہو چکے ہیں مگر افسوس کہ سینکڑوں شعرا ادبا سے واٹس اپ پر رابطہ ہے مگر کسی نے بتانا بھی مناسب نہ سمجھا۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ کل کلاں ہماری بھی باری ہے تو کتنے دکھ کی بات ہوگی کہ کسی کو کوئی خبر بھی نہ ہو۔ میرا یہ معمول ہے کہ میں بھرپور مضمون لکھتا ہوں مرحومین پر اور واٹس پر تمام گروپوں میں بھیج دیتا ہوں اور یقین کیجئے کہ اسی دن درجنوں نہیں سینکڑوں احباب افسوس کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کرتے ہیں۔اس طرح کئی لوگ مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو یقین کیجئے مرحوم کے لئے کس قدر اہم ہے۔ یہ تو ہمیں مرنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔!!!!

مسز کوثر علی صاحبہ 1962 میں پاکستان کراچی سے برطانیہ تشریف لائیں۔ لندن یونیورسٹی سے بچوں کی تعلیم کا ہائر ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۷۴ سے تعلیمی شعبے میں داخل ہوئیں، اور لندن کے کئی مین سٹریم سکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ سال تک ایسیٹ لینگویجز کیمبرج کے ساتھ بھی کام کیا۔اے۔ایل۔ایل کی ممبر شپ کے علاوہ وہ انکی ورلڈ لینگویجز کے سٹیرنگ گروپ کی ممبر بھی تھیں جس کا کام تمام زبانوں کی ترقی کیلئے جدوجہد کرنا ہے اور کسی اہم کمی کو درست کرنے کیلئے تعلیمی محکمے میں نمائندگی کرنا، تعلیمی پالیسیوں پر نظر رکھنا اور برطانیہ کی اقلیتی زبانوں کو جن میں اردو بھی شامل ہے ان کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی اداروں میں فروغ دینے کی کوشش کرنا، اور زبانوں کے اساتذہ کو ہر نئی اور کارآمد تعلیمی سکیم سے بہرہ ور کروانا، یہ کام جاری رکھا۔ کوثر علی نے ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری جو نہایت مقدس پیشہ ہے انہوں نے اردو تعلیم رضا کارانہ پڑھانے سے ابتدا کی اور پھر اپنی قابلیت اور محنت سے مین اسٹریم میں ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے برطانیہ میں اپنے طویل تجربات سے اردو زبان کی آب یاری کی اور ایشین بچوں میں اردو زبان کو فروغ دیا۔ انہوں نے کمیونٹی کے لئے اور اردو زبان کی ترقی ترویج کا وہ وہ کام کیا جو کم ہی لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ یہ ننھی سی جان جو اندر سے کسی پہاڑ سے کم نہیں بلا کی ہمت رکھتی تھیں۔ اور قابل تعریف ہیں ایسے لوگ جو بغیر کسی تعریف و توصیف کی طمع اور نمائش کے اپنی کمیونٹی کی خدمات میں مصروف ہیں وہ قابل احترام ہیں۔ انہوں نے اپنے کام کے متعلق ابتدائیہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جسے پڑھ کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسے مخلص لوگ بہت کم دیکھے گئے ہیں جنہوں نے ایک گمنام ہیرو بن کر ایشین کمیونٹی کی خدمات کی۔ کوثر علی پہلی خاتون تھی جنہوں نے میرے علم کے مطابق ڈرامے کی صنف میں اتنا کام کیا جسے انہوں نے کتابی شکل میں دنیائے اردو کو دیا جو قابل تعریف ہے۔ گو ان کے یہ ڈرامے ان کے اسکول کے لیول کے تھے جو انہوں نے اپنی کلاس کے بچوں سے پلے کروائے۔ مگر ان میں جن جن موضوعات پر لکھا گیا وہ نہایت اہمیت کے حامل تھے۔ تمام کہانیاں مغربی اور مشرقی معاشرے کے تصادم کے تناظر میں لکھی گئیں اور تمام کی تمام کہانیاں کسی نہ کسی سچے واقعات کے خمیر سے اٹھیں۔ انہوں نے اردو کی ایک بے جان ہوتی ہوئی صنف میں نئی جان ڈال کر اردو کے قلمکاروں کو احساس دلایا کہ اردو میں صرف شاعری، افسانہ ہی نہیں ڈرامہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ آٹھ ڈراموں کے اس مجموعہ کا نام ''آئینہ حیات'' ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں تدریس کا نصابی گائیڈ (پہلی جماعت سے اے لیول تک) جو گولڈسمتھ یونیورسٹی آف لندن کے زیر ہدایت بھی شائع ہوا۔

1978 سے مضامین اور کہانیاں لکھنا شروع کیں اور پھر اردو انگریزی میں شعر و شاعری بھی کرنا شروع کی۔ نثر اور شاعری دونوں اصناف میں لکھا۔

چند سال پہلے ان کے ریٹایئر ہونے سے پہلے ایک خیراتی ادارے 'کڈز آوٹ' نے ایک تعلیمی پروجیکٹ شروع کیا جس میں برطانیہ کی بیس مقبول زبانوں کے بولنے والوں (جنکی مادری زبان ہو) سے اپنے ملک کی تہذیب اور روایات کے بارے میں کہانیاں لکھنے کی درخواست کی جو کہ انگریزی میں بھی ہوں اور جن میں اخلاقی پہلو نمایاں ہو۔ کوثر علی نے اردو زبان کی پانچ کہانیاں انہیں لکھ کر ہدیہ کے طور پر دیں جنہیں بی بی سی نے بھی ریکارڈ کیا ہے۔ یہ پروجیکٹ نہایت منفرد تھا جس کی وجہ سے ۱۰۵ کہانیاں بیس زبانوں میں اور ہر کہانی انگریزی میں بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ آج تک ہزاروں سکول ان سے مستفید ہو رہے ہیں اور بیشمار بچے انہیں سن کر اور پڑھ کر دنیا کے مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن اور وہاں کے حالات سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ آمین

# آفتابیات

کسی بھی انسان کی جبلت کو بدلا نہیں جا سکتا کیونکہ جبلت فطرت کے اس قانون پر مبنی ہوتی ہے جو معاشرتی رویوں سے بدلاؤ کا شکار ہو کر بھی اپنی اصل میں کہیں نہ کہیں برقرار رہتی ہے۔خواہشات کی تکمیل اور جنسی عوامل کا منہ زور رویہ اسی جبلت کی وہ خاصیت ہے جو ہمارے معاشرے میں اندھیرے میں تو قبول کیا جاتا ہے جبکہ اس کو دن کے اجالے میں قابلِ سنگسار سمجھا جاتا ہے۔وہ معاشرے جو حقیقت سے نظریں چرا کر الزام تراشی کے ستونوں پر اخلاقیات کا بوجھ ڈالتے ہیں تو بہت جلد جھوٹ کے وزن سے ضمیر اور اخلاقیات کا جنازہ کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔جب تک حقیقت کی آنکھ سے معاشرے کو دیکھا نہیں جائے گا جبلت کا ہتھوڑا برستا رہے گا۔

◆

خون کے رشتوں کا تقدس آفاقی نوعیت کا قرار دیا جاتا ہے لیکن پیسے کی چمک بعض اوقات اس آفاقیت کے چاند کو گہنا دیتی ہے۔ایک کوکھ سے جنم لینے والے بہن بھائی جب زمین کی تقسیم پر گتھم گتھا ہوتے ہیں تو خون کی رنگت اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیتی ہے۔شاید لالچ کا خون حقیقی خون سے برتر ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک بھائی دوسرے بھائی کے ہاتھوں سے زلیل کیسے ہوتا؟ ایک بہن یا ماں اپنے حق سے محروم کیسے ہو جاتی؟ایک باپ بیٹوں کی وجہ سے در بدر کیوں ہوتا؟ خون کے رشتے ضروری نہیں ساتھ نبھائیں اس لیے کہ دودھ کی جاگ درست بھی لگی ہو پھر بھی دہی میں کھٹاس پیدا ہو جانا اچنبھے کی بات نہیں۔

◆

غزل الزام دے کے لائے مصیبت تو کیا ہوا آتی ہے روز اک نئی آفت تو کیا ہوا ظاہر ہوئے ہیں کیسے سبھی ان کے کاروبار کہتے ہیں اب کہ کر دی شکایت تو کیا ہوا صورت تو ان کی دیکھ کے حیراں ہوئے سبھی آئی ہے سامنے جو یہ سیرت تو کیا ہوا اس عمر میں بھی عاشقی کا ان کو شوق ہے آتی ہے جب بتوں پہ طبیعت تو کیا ہوا تھوڑی سی پی بھی لیں تو دوا اس کو جان لیں اس پر نہیں ہے ان کو ندامت تو کیا ہوا اترا لباس ان کی سبھی پارسائی کا کہتے ہیں دیکھتی ہے جو خلقت تو کیا ہوا انجام جھوٹ کا تو ہمیشہ بُرا ہوا سب ان کی کھوگئی ہے جو عزّت تو کیا ہوا تو بہ کا در کھلا ہے جو بھی آئے لوٹ کے ہو جائے گی کسی پہ۔

◆

اخلاقی تعلیم اسلام کا طرہ امتیاز ہے جس نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا وہ تہذیب جو دشمنوں کو معاف کر دینے، ہمسائے سے حسنِ سلوک، والدین کا احترام، استاد کی عزت، رحم دلی، شفقت، مسکراہٹ، شرم وحیا، باہمی رفاقت و مساوات جیسے لاتعداد رویوں کو زندگی کا حصہ بنا دینے کا درس دیتی ہے۔دنیا نے اس تہذیب کو اپنایا اور اپنوں نے اخلاقیات کو دوسروں پر چھوڑ دیا۔ترقی یافتہ ممالک میں نرسری سے لیکر ہائیر کلاسز تک اخلاقیات کو نصاب کا حصہ بنا کر ضرور پڑھایا جاتا ہے۔اور ملکِ خداداد میں غیر مسلموں کو تو اخلاقیات پڑھائی جاتی ہے لیکن عام لوگوں کے لیے شاید اس کا اہتمام اس لیے نہیں کیا جاتا کہ ہم اخلاقیات سے بالاتر ہو چکے ہیں؟ یا پھر ہم نے سچ میں اس کو دوسروں کی جاگیر سمجھ رکھا ہے۔

◆

محبت میں ضروری نہیں چاہت کا بندھن دونوں فریق باندھ کر رکھیں کچھ لوگ اپنی زندگی میں پجاری بن کر گزار دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ محبت کی دیوی کو گھٹنوں کے بل جھک کر سلام پیش کرتے رہیں اس کی پراتھنا میں سب کچھ دھان کر دیں اپنے وجود کے ٹکڑے اس دیوی کو بھینٹ کر کے کسی بہتے دریا کی مانند پیروں میں بکھرتے چلے جائیں چاند ستاروں کو اس کے ابرو کے ایک اشارے پر زمین بوس کر کے رفیقِ دل کے حضور پیش کر دیں۔دنیا کی چاہ کو ایک فرد سے منسوب کر کے اسی کو دنیا قرار دینا اس پجاری کا شیوہِ زندگی ہوتا ہے تبھی وہ ہر چوٹ پر مسکرا کیا گلی چوٹ کا انتظار کرتا ہے کیونکہ پجاری مانگنے پر نہیں دینے پر یقین رکھتا ہے۔

◆

بعض راستے منزل کی جانب جاتے ہیں لیکن وہ منزل نہیں کہلاتے وہ راستے اپنے رنگ وروپ میں زندگی کے دھارے میں شامل ہو کر منزل کی یاد کو محو کر دیتے ہیں ان راستوں سے لگاؤ منزل کی تلاش کو بیمعنی کر دیتا ہے۔دل کا سکون اور قرار کبھی کبھی ایک پگڈنڈی کے بل کھاتے سرے سے اس طرح جڑ جاتا ہے کہ کبھی گمان ہی نہیں گزرتا کہ اس کا اختتام اشکوں سے آنکھوں کو ویران کر دے گا اور لمسِ لطافت کی چاشنی جدائی اور ہجر کو دیکھ کر آنکھیں بند کیے رہتی ہے۔بعض لوگ تمام عمر ان ہی راستوں کے مسافر رہنا چاہتے ہیں

ان کے لیے منزل ایک پڑاؤ سے زیادہ کچھ نہیں جبکہ کچھ منزل کو حاصل کر کے بھی بے فیض ہی رہتے ہیں۔

حسن کو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو جانچا نہیں جا سکتا۔ دنیا میں ابھی وہ پیمانہ یا آنکھ ہی نہیں بنی جو حسن کی تعریف کو کسی ایک اکائی میں سمیٹ دے۔ ہر شخص کی آنکھ کا عدسہ الگ ہوتا ہے اسی لیے حسن کے انداز بھی اس کے ہاں اور ہوتے ہیں وہ لوگ جو حسن مجسم کو حسنِ متصور سے ملا کر زندگی بسر کرتے ہیں وہ ماں کے جھریوں والے چہرے سے بھی عقیدت و پیار رکھتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو حسنِ مجسم کے قائل ہوں تو ڈھلتے جسم اور رعنائی سے نئے جہانوں کا رخ کر لیتے ہیں۔ وہ رنگ جو آنکھ سے دل میں جا کر ٹھہر جائے حسن کا مکمل زاویہ ہے جو زندگی کے ہر حصے میں ایک ہی رنگ میں ڈھلا نظر آتا ہے۔

پتنگ جب آسمان کی بلندی پر پہنچ جاتی ہے تو اس کی نگاہ میں تمام چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں اس کا سینہ فخر سے چوڑا ہو جاتا ہے اور سر مزید بلندی کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ تبھی اچانک تیز ہوا کا جھونکا اس کے جسم کے توازن کو اس طرح خراب کرتا ہے کہ بدن کا غرور لرزنا شروع ہو جاتا ہے اور کسی کمزور لمحے میں جسم کا فانی وجود بکھر کر اپنی ناتوانی اور بیثباتی کا اعلان کر دیتا ہے۔ ڈور چاہے جتنی مرضی مضبوط ہو پتنگ تب تک ہی اڑتی ہے جب تک ہوا اس کا ساتھ دیتی ہے۔

اندرونی اور داخلی خوبصورتی کا فلسفہ تب تک درست ہے جب تک لوگوں کی حقیرانہ نگاہ حقیقت کے در نہ کھول دے۔ انسان کا اچھا ہونا وہ کتابی بات ہے جو معاشرے میں بہت کم نظر آتی ہے لوگ تو نظر آتے ہیں لیکن کوئی بھی اچھا بننا نہیں چاہتا۔ محبت کے لیے اندھا ہونا شرط ہے لیکن اندھے کے لیے محبت جاگ جانا آج بھی معاشرے میں ناپید ہے۔ جسمانی اعضاء کا حسن سے کوئی تعلق نہیں یہ فقرہ وہ لوگ بولتے ہیں جن کی آنکھ اور دل رہ چلتے لوگوں کا ایکسرے اس طرح کرتے ہیں کہ کپڑوں میں بھی لوگ برہنہ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان سب برابر ہیں تو امارات کا جوتا غربت کے ماتھے پر نشان کیسے ثبت کر دیتا ہے؟ علم سے بڑی دولت نہیں لیکن بنک میں پڑی دولت بہت سے علم والوں کو اپنے پرس میں رکھ کر چلتی ہے۔ کتابی باتیں درست ہوتی ہیں لیکن تب تک جب تک حقیقت کی آنکھ روشن نہ ہو جائے۔

ہم ان قوموں میں شمار ہوتے ہیں جو اسلاف کا ذکر کریں تو تنقید ہوتی ہے اور اگر موجودہ ترقی کا ذکر کریں تو بھی تنقید ہوتی ہے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ دنیا کو ہماری ضرورت کیوں ہوگی اگر ہم دنیا کے فائدے کے لیے کام نہیں کرتے اور ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ ہمیں دنیا کی ضرورت کیوں ہے کیونکہ بغیر دنیا کے ہم ماضی کا سفر تو کر سکتے ہیں لیکن مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ تو پھر ایسی قوم کی تعمیر کرنا ضروری ہے جو ماضی کے دانشوروں سے عقل اور شعور سیکھے اور حال میں رہ کر قوم کی وہ تربیت کرے جو مستقبل کی امین ہو۔ خالی دانشوری بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدل سکتی۔

## مصری قائمقام وزیر خارجہ کی طرف سے چوھدری محمد ظفر اللہ خاں کو خراج عقیدت

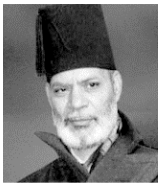



قاہرہ: ابراہیم فراغ پاشاں قائمقام وزیر خارجہ مصر نے آج چوھدری محمد ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان کو زبردست خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ پاکستان نے وادی نیل کے متعلق جو حکمت عملی اختیار کی ہے اہلِ مصر اس کے لئے سپاسگذار ہیں۔ نمائندہ ایسوسی ایٹیڈ پریس نے جب آپ سے پوچھا کہ مصر و برطانیہ کے تنازعہ کو ختم کرانے کے لئے پاکستان کی روش کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو ابراہیم فراغ پاشاں نے کہا کہ پاکستان اخلاص اور اس کی سرگرمیاں قابلِ ستائش ہیں۔ اختیار کرنے پڑیں گے لیکن وہ اقدامات کیا اور کس رخ پر ہوں گے اس پر سر دست بحث نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ فلسطینی عرب مہاجر کے بارہ میں انہوں نے کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ انہیں دوبارہ ان کے آبائی مکان میں آباد کیا جائے۔ مصری قائمقام وزیر خراجہ ابراہیم فراغ پاشاں نے آج مصر کے مطالبات منوانے کے متعلق پاکستان کے وزیر خارجہ چوھدری ظفر اللہ خان کی کوششوں کو سراہا اور کہا ہے کہ ہم انکی دعا نت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

***

ماہِ رمضان کی معصوم یادیں۔ باتیں!

# روزہ کُشائی۔ پہلا روزہ

رئیس صِدّیقی

اُس دن مِلا زندگی کا سب سے اہم سبق!

ماہِ رمضان میں اکثر مجھے لکھنؤ میں گذرہوا اپنا بچپن یاد آنے لگتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے سے یادوں کا معصوم اور ست رنگی کارواں گزرنے لگتا ہے۔ بچوں سے اپنے بچپن کی باتیں کرنے کا دل چاہتا ہے کیوں کہ ہر بچہ کا بچپن اسکی زندگی کا پیاری پیاری باتوں سے بھرا انمول سرمایہ ہوتا ہے۔

اس وقت میری عمر تقریباً نو یا دس سال کی ہوگی۔ شدت سے گرمی پڑ رہی تھی جیسے آج کل پورے ملک میں گرمی کی تپش کا زور ہے۔ میں روزانہ صبح سحری میں اٹھ جاتا۔ یا یوں کہیں کہ دودھ، پھینی اور دیسی گھی میں تلے آلو کے پراٹھوں کی خوشبو مجھے اٹھا دیتی تھی۔ اس کے علاوہ، ان دنوں سحری کے وقت، روزانہ اللہ کے کچھ نیک بندے اپنی ترنم ریز آواز میں سحری نعرہ لگاتے کہ جاگو سونے والو۔ غفلت کی نیند سے اٹھو۔ سحری کا وقت ہوگیا ہے۔ نیند کا شیطان بہکائے گا۔ اس کے بہکاوے سے بچو۔ یہ مبارک مہینہ ہے، دوبارہ نصیب ہو نہ ہو۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا وغیرہ وغیرہ۔

وہ لوگ ڈفلی بجانے کا اپنا ہنر دکھاتے۔ عقیدت بھری آواز میں سحری نغمے گاتے۔ منقبت، نعت اور حمد پیش کرتے۔ گویا کہ وہ لوگ سحری کے لئے اٹھا کر ہی دم لیتے۔ میں روزانہ سحری کر کے جلدی سے سونے کی کوشش کرتا لیکن امی اپنے ساتھ نماز پڑھواتیں اور تب جا کر سونے کی اجازت ملتی۔ ان دنوں روز شام کو مسجد میں افطاری پہنچانے کا عام رواج تھا۔ یہ میری ڈیوٹی تھی کہ میں روز مسجد میں افطاری پہونچاؤں۔ میں وہیں رک کر روزہ کھولتا، افطار کرتا اور مغرب کی نماز ادا کرتا۔ ایک دن امی نے کہا کہ جب تم روز سحری کرتے ہو۔ روزہ کھولتے ہو، افطار کرتے ہو، نماز پڑھتے ہو، تو تم روزہ بھی رکھ لیا کرو۔ چاہتا تو میں بھی یہی تھا لیکن اکثر والدین اپنے بچوں کو کم عمری میں روزہ رکھنے کے لئے اصرار نہیں کرتے ہیں، خاص طور سے گرمی میں۔ اس لئے مجھے بھی اپنے والدین کی رضامندی کی ضرورت تھی۔ بہرحال روزہ کشائی کے لیے چودھواں روزہ مقرر ہوا۔

سحری میں میری پسند کی چیزیں بنائی گئیں۔ اس سحری میں کچھ زیادہ ہی چیزیں تھیں۔ خاص طور پر کئی شربت تھے۔ سہ پہر سے ہی افطاری اور کھانا پکانے کا اہتمام ہونے لگا۔ رشتے داروں اور محلہ کے بہت سے لوگوں کو افطار کی دعوت دی گئی۔ رشتے داروں کو عشائیہ یعنی ڈنر کی بھی دعوت تھی۔ دعوت دینے کی ذمیداری میں مجھے بھی لگایا گیا۔ اسکا فائدہ یہ ہوا کہ میرا بہت سا وقت اس نیک کام میں گذر گیا۔ کچھ وقت نماز اور تلاوت قران میں بیتا۔

جو جو وقت گذر رہا تھا، پیاس اور بھوک شدت اختیار کر رہی تھی۔ امی یہ سب کچھ محسوس کر رہی تھیں۔ لہٰذا وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مجھے اپنے پاس بُلاتیں اور روزہ رکھنے کی فضیلت بیان کرتیں۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مجھے نصیحت کی تھی بیٹا، بہت سے غریب لوگ بھوک اور پیاس سے بیمار ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مرجاتے ہیں۔ ہمیں انکی مدد کرنی چاہیے۔ ہمیشہ پانی اور کچھ کھانے کا سامان اپنے ساتھ رکھنا چاہے اور راستے میں، اسکول میں یا اپنے در پہ آئے لوگوں کی مدد کرنی چاہئے۔ پھر کہتیں کہ جاؤ تھوڑی دیر آرام کرلو۔ میں کمرہ میں جاتا، پلنگ پر تھوڑا آرام کرتا۔ کروٹیں بدلتا، اٹھ جاتا، کچھ پڑھتا، لیکن آرام کہاں؟ پھر باہر آجاتا۔ امی مسکراتیں اور اپنے پاس بٹھا کر پھر ماہِ رمضان کی اہمیت بتانے لگتیں۔

بیٹا، یہ مہینہ ہمیں ٹریننگ دیتا ہے کہ ہم اپنی بھوک، پیاس، غصہ، لالچ، غیبت، وقت کی بربادی اور تمام برائیوں پر کیسے قابو پائیں تاکہ ہم آیندہ آنے والوں دنوں میں ایک اچھے انسان کی طرح اپنے گھر، اپنے سماج اور اپنے ملک کا بھلا کرسکیں! بہرحال، شام کے چھ بج گئے۔ مجھے تیار ہونے کے لئے کہا گیا۔ پہننے کے لئے مجھے نیا جوڑا دیا گیا جو میری خالہ میرے لیے لیکر آئیں تھیں۔ سفید چوڑیدار پاجامہ، لکھنوی چکن کا سفید کرتا اور چکن کی جالیدار خوبصورت ٹوپی اور تین عدد رنگ برنگے رومال۔ اسکے بعد مجھے گرمی کے لحاظ سے سوتی کپڑے کی سفید شیروانی پہنائی گئی۔ امی نے مجھے بہت اچھا سا عطر لگایا۔ والد صاحب کی منھ بولی بہن، میری پھوپی جان نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ اسطرح مجھے کسی دولھے راجہ کی طرح خوب تیار کیا گیا۔ رشتے داروں میں کچھ لوگ پھل، تو کچھ لوگ سوکھا میوہ اور دیگر کھانے کی چیزیں سینی یعنی بڑی سی تھال میں سجا کر، سنہرے اور روپہلے گوٹے لگے کنارے والی سرخ ریشمی خوان سے ڈھک کر لائے تھے۔ اِسی کے ساتھ مبارکباد اور دعائیں دینے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

کوئی بہت پیار اور محبت سے گلے لگا رہا تھا تو کوئی سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر رہا تھا گویا کہ مرکز تقریب میں اور صرف میں تھا۔ دفتر سے والد صاحب بھی آگئے۔ بہت پیار سے مجھے اپنے سینے سے کافی دیر تک لگائے رکھا اور بہت سی

دعائیں دیں۔

تقریباً ساڑھے چھ بجے ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔افطاری میں کھجور، تخم ملنگا کا شربت (چھوٹے چھوٹے سفید دانے کے برابر پھول والا شربت)، فالسہ کا شربت، روح افزا، شکنجی، نمکین لسی، پیاز کے پکوڑے، بیسن میں تلی ہوئی مرچ، کابلی چنے، دہی بڑے، آلو کے قطلے، تربوز، خربوزہ، سنگترے، ناشپاتی، بہو گوشہ اور آم کی قاشیں، کیلے کے قطلے، ہرے اور اُنابی انگور۔غرضکہ انواؤ اقسام کی نعمتیں دسترخوان کی زینت بنی ہوئی تھیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر میرے منھ میں پانی آرہا تھا۔ابو جان نے میری حالتِ غیر کو بغور دیکھا اور فرمایا۔بیٹا، یہ وقت اپنے نفس، اپنی بھوک، پیاس اور اپنے اوپر قابو پانے کی تربیت کا ہے۔اس وقت اللہ سے دعاء کرو کہ وہ ہمارا روزہ قبول فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم پورے مہینے روزہ رکھ سکیں۔پھر ہم سبھی لوگ دعا کرنے لگے کہ اتنے میں ایک گولہ دغہ جو کہ افطار کا وقت ہونے کا اشارہ تھا اور پھر مسجد سے اذان کی آواز آئی۔

میں نے سب سے پہلے کھجور سے روزہ کھولا اور شربت روح افزا پیا پیاس اور بھوک کو تھوڑی راحت ملی۔پھر جلدی جلدی بیسن میں تلی پیاز کی پھلکیاں کھانے لگا۔امی نے اشارہ کیا کہ میں آرام سے کھاؤں۔افطاری کے بعد، گھر پر ہی نماز باجماعت پڑھی گئی کیونکہ خاندان اور محلہ کے بہت سے افراد میری روزہ کشائی میں شریک ہوئے تھے۔کچھ دیر دینی اور غیر دینی باتیں ہوئیں۔پھر دسترخوان پر کھانا لگنے لگا۔ڈنر میں بھی مزے مزے کے پکوان تھے۔مجھے یخنی پلاؤ اور سفید زردہ بہت پسند ہے۔رومالی روٹی، کباب، قورمہ دوپیازہ اور پسندیدہ کے ساتھ شیر مال بھی کھائی۔شاہی ٹکڑے اور کھیر کا بھی مزہ لیا۔یعنی اتنا کھایا کہ پیٹ پھول گیا۔

پھر میری ڈیوٹی لگی کہ میں مسجد کے امام صاحب کو کھانا دیکر آؤں۔اُن دنوں مسجد کے امام کو دوپہر اور رات کا کھانا پہونچانا محلہ کے ہر گھر پر اخلاقی طور پر لازمی تھا۔ہر گھر کا دن اور وقت مقرر تھا۔

بہر حال، اس ماہ بقیہ پورے روزے رکھے۔پھر یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن مشاہدہ اور تجربہ یہ بھی ہوا کہ اللہ جسے توفیق دے، وہی شخص روزہ رکھ سکتا ہے!!!

(مضمون نگار دوردرشن و آکاشوانی کے سابق آئی بی ایس افسر اور ساہتیہ اکادمی قومی ایوارڈ و دلی اردو اکادمی ایوارڈ سے سرفراز پندرہ کتابوں کے مصنف، مولف، مترجم، افسانہ نگار، شاعر و ادیبِ اطفال ہیں)

# گر نہ بودے درمقابل

احمد منیب

کسی بھی معاشرہ کی ترقی کا راز اس معاشرہ کے لیے دائیں بازو اور صاحب اقتدار میں ہی مضمر نہیں ہوتا بلکہ بائیں بازو کی قوتیں بھی اس میں بہت مثبت کردار ادا کرسکتی ہیں کیونکہ انسان ایک نامکمل نہیں تو زیر تکمیل مخلوق ضرور ہے اور اس کی کمزوریاں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ہیں کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا کہ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔زیرِ تکمیل اس لیے کہا کہ یہ بھی ایک حسنِ ظن ہے اور بعض زیرِ تکمیل اشیا ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا حسن ہی ان کے زیرِ تکمیل رہنے میں پوشیدہ ہوتا ہے۔انسان بھی انہی زیر تکمیل اشیا میں سے ایک ہے۔کہنا یہ مقصود ہے کہ ہر جگہ دو قسم کی قوتیں کارفرما دکھائی دیتی ہیں ایک خیر کی قوت ہے اور دوسری شر کی قوت۔بالفاظ دیگر پہلی کو لِمّۂ خیر کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو لِمّۂ شر۔بڑے بڑے فلاسفر اس بات کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ اَضداد سے ہی اشیا پہچانی جاتی ہیں۔عربی محاورہ ہے کہ وَبِضِدِّھَا تَتَبَیَّنُ الْاَشْیَآءُ۔کہ اشیا اپنی ضد یعنی اپنی الٹ سے پہچانی جاتی ہیں۔فارسی میں ایک شعر بھی اس بات کی ترجمانی کے لیے بہت عمدہ ہے کہ:

گر نہ بودے درمقابل روئے مکروہِ سیاہ
کس چہ دانستے جمالِ شاہدِ گلفام را

حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا حضرت! اتنی عقل کہاں سے سیکھی؟ فرمایا: بے وقوفوں سے! عرض کیا حضور! بے وقوفوں سے کس طرح؟ فرمایا جو وہ کرتے ہیں میں ان کے اُلٹ کرتا ہوں۔

اَضداد میں رات اور دن کی مثال بڑی واضح ہے۔اگر رات نہ ہو تو دن کی افادیت اور کیفیت واضح نہ ہو سکے۔اگرچہ رات اپنی بہت بڑی افادیت رکھتی ہے لیکن اس وقت بحث روشنی اور اندھیرے کے لحاظ سے فرقِ محض کی ہے۔عربی زبان میں اَضداد کی بحث کے حوالہ سے دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک علامہ جاحظ اور دوسرے علامہ حریری۔علامہ جاحظ سیاہ رنگ کے بہ ظاہر خوب صورت انسان نہیں تھے لیکن علم دوست شخصیت تھے۔آپ نے 159 نابغۂ روزگار کتب تصنیف کیں۔ان کی وفات بھی اسی طرح ہوئی کہ اپنی لائبریری میں تھے کہ کتابوں کا ایک ڈھیر ان پر گرا، آپ شدید زخمی

ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے میں تو انہیں ''شہیدِ علم'' کہتا ہوں۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف ''اَلْمَحَاسِنُ وَالْاَضْدَادُ'' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور مقالات حریری میں ''دِیْنَارِیَہ'' کا اپنی زبان دانی، مضمون نگاری، نثری و نظمی سلاست وفصاحت و بلاغت میں کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔

علامہ جاحظ ایک عالم انسان تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ خوب صورت نہ تھے بلکہ بہ ظاہر انتہائی بدصورت تھے لیکن بہ باطن بہت حسین تھے کیونکہ طبیعت میں شکر و احسان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ سے ملنے کے لیے آیا۔ خادم سے پوچھا کہ کیا علامہ گھر پر ہیں؟ نوکر نے جواب دیا کہ ہیں۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہیں؟ خادم نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔ وہ شخص بڑا حیران ہوا کہ علامہ جیسا نابغۂ روزگار، دُرِّ ساطع اور یہ کام!!! معاذ اللہ! پوچھا کہ جھوٹ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ پر! لیکن وہ کیسے؟ خادم نے جواب دیا کہ جب آپ نے آواز دی تو علامہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَاَحْسَنَ خَلْقِیْ کہ شکر ہے اس ذات بابرکات کا کہ جس نے مجھے پیدا فرمایا اور مجھے نہایت حسین صورت عطا فرمائی۔''

اب دیکھیے کہ علامہ جاحظ نے کیسے مثبت انداز میں سوچا اور خادم نے بھی اُس میں سے ایک ذَم کا پہلو نکال لیا۔ بہرحال ظاہری بدصورتی اور باطنی خوب صورتی کا حسین امتزاج علامہ جاحظ میں ملتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر مدمقابل کچھ نہ ہو تو کسی چیز کی بھی کوئی اہمیت نہیں بنتی۔ قبح حسن کو ممتاز کرتا ہے، بدی نیکی کو، برائی اچھائی کو اور بدصورتی حسن و جمال کو۔ اسی طرح بدتمیزی شرافت کو اور حزبِ اختلاف حزبِ اقتدار کو اور نفرت محبت کو۔

کسی بھی ملک کے سیاسی نظام کا سب سے بڑا منفی پہلو یہی ہوتا ہے کہ صاحبِ ایوان، حزبِ اختلاف کو پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ کسی طرح صاحبِ اختلاف یعنی بائیں بازو کی قوت کو کچل کر رکھ دیا جائے یا کم سے کم ایوان سے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ یعنی وہ تنقید سے گھبراتے ہیں اور نہ تو سننا چاہتے ہیں نہ برداشت کرنا جانتے ہیں گویا وہ ایک ہی بات جانتے ہیں کہ ہم چونکہ اقتدار میں ہیں اس لیے ہمارے خلاف بات کہنا، لکھنا اور شائع کرنا نہایت درجہ ظلم اور بری بات اور موت کا پیغام لانے یا مقتل کے دروازہ پر دستک دینے کے مترادف ہے۔ یا کم از کم ایسے کسی شخص کو ایوان میں رہنے کا کوئی حق نہیں جو ہماری ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔ حالانکہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرنا ہی تو عملِ مقبول اور امرِ احسن ہے۔ دوسری طرف دیکھیں تو حزبِ اختلاف کی طرف سے بھی تو کوئی معیاری اور تعمیری تنقید سامنے نہیں آ رہی ہوتی بلکہ محض شخصیت پرستی، شخصی تنقید، کردار کُشی کے ساتھ ساتھ خواہ مخواہ ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالا جا رہا ہوتا ہے۔ یہ تو مہذب اور متمدن اقوام کا شیوہ و وطیرہ نہیں نہ ہی کسی شریف انسان کو زیب دیتا ہے۔ اس کیچڑ کے کالے چھینٹے قلبِ عوام تک بھی پہنچتے ہیں اور مثبت رویوں کو یہ بدنما سیاہ داغ دھبے ڈھانکتے چلے جاتے ہیں۔ یوں سیاسی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سماجی برائیوں کو پنپنے کے لیے عمدہ موسم اور موافق حالات میسر آ جاتے ہیں۔

سیاسیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کے طور پر میری نگاہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس سمیت دیگر ترقی یافتہ ممالک کے آئین و دساتیر پر بھی ہے اور چین، بھارت اور پاکستان کے سیاسی حالات پر بھی۔ میرا تجزیہ، مشاہدہ اور مطالعہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر میں محض یہ فرق ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں حکومت الگ چلتی ہے جبکہ ادارے اور ترقیاتی کام الگ مستقل بنیادوں پر مستقل اداروں کے سپرد ہوتے ہیں۔ حکومتی ایوان میں چاہے کوئی بڑے سے بڑا طوفان آ جائے یہ ترقیاتی کام بند نہیں ہوتے جن کی وجہ سے ملک مجموعی طور پر آہستہ آہستہ ترقی پذیری کی حدود سے نکل کر ترقی یافتگی کی سطح کو چھو لیتا ہے لیکن ترقی پذیر ممالک کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ان ممالک میں ترقیاتی ادارے، حکومتِ وقت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ایک حکومت برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے اپنے سے پہلی حکومت کے تمام ترقیاتی منصوبوں کو بند کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتی ہے اور سمجھ داری کا ثبوت نہیں دیتی۔ یوں نہ تو اپنی مدت پوری کر سکتی ہے نہ کوئی ترقیاتی کام انجام پذیر ہوتے ہیں۔ بار بار کے انقطاع کی وجہ سے دل بھی کٹھا ہو جاتا ہے۔ ملک کی قوت خرید کمزور پڑ جاتی ہے۔ مجموعی طور پر بے قدری کا عمل سامنے آ کر معاشی حالات میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے چنانچہ منفی اور شر کی قوت کی طاقت بڑھ جاتی ہے اور وہ خیر کی قوت پر غالب آنے لگتی ہے اور مثبت رویوں کی

بجائے منفی استعداد کی قوتیں فروغ پا جاتی ہیں۔فورم خواہ سیاسی ہو یا سماجی، معاشی ہو یا اقتصادی ہر جگہ ایک معیاری حزبِ اختلاف کی تعمیری تنقید اور جذبۂ حب الوطنی اور عزمِ ترقی لے کر حزبِ اقتدار کے شانہ بہ شانہ چلنے سے ہی ملک کو ترقی پذیری کی شاہراہ پر کامیابی کے ساتھ گزار کر ترقی یافتگی کی منزل سے روشناس کروایا جا سکتا ہے۔بات ہم ملک کے کسی گاؤں کی کریں، کسی شہر کی کریں یا کسی صوبہ کی۔ ہر جگہ کا اپنا اپنا ایک سیاسی معیار ہے۔اس معیار میں لازماً دونوں حزب موجود ہوتے ہیں۔آج اگر ہم ایک دوسرے پر منفی تنقید کرنا بند کر کے تعمیری تنقید کے معیاری رویہ کو فروغ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمارا کل بہت روشن اور تاب ناک ہو سکتا ہے۔وگرنہ ہم کس قدر روشنی میں ہیں یا کس قدر اندھیرے میں! ہم سب بہ خوبی جانتے ہیں۔دونوں قسم کے گروہوں کو ملک کر ملکی اور قومی سلامتی و ترقی کے بارہ میں سوچنا ہوگا۔حزبِ اقتدار کو ہر صورت حزبِ اختلاف کا وجود تسلیم کرنا ہوگا جس سے اس کی صفات کا ظہور ممکن ہو سکے گا اور اس کا کو انجام دینے کی ایک سمت مختص ہوگی۔اس کے برعکس حزبِ اختلاف کو محض تنقیدی نہیں بلکہ تعمیری تنقید کر کے حزبِ اقتدار کا ساتھ دینا ہوگا تبھی ملک میں معاشی، معاشرتی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی ابتری کا خاتمہ کر کے اپنا گھر بچایا جا سکتا ہے لیکن اخلاق یا معاشرت اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتی کہ آپ یہ کہیں کہ آپ حزبِ اختلاف کے ساتھ مل بیٹھ کر بات نہیں کرنا چاہتے یا آپ حزبِ اختلاف ہیں تو آپ یہ کہہ کر اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دے رہے ہوں گے کہ ہم حکومت کے ساتھ بیٹھ کر بات نہیں کرنا چاہتے اور ان کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔یہ دونوں رویے آپ کی ہٹ دھرمی اور معاملات کو بگاڑنے پر دلالت کرتے ہیں۔ان ساری باتوں سے اس چیز کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی نے کیا ہی سچ کہا ہے کہ:

گر نہ بودے درمقابل روئے مکروہِ سیاہ
کس چہ دانستے جمالِ شاہدِ گلفام را

سوچنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نیکی اور بدی کے راستے پیدا فرمائے ہیں، اپنے لیے رحمانیت چنی اور ابلیس کے لیے شیطانیت۔اب جو اللہ تعالیٰ کا ہے اسے تو رحمانیت ہی چننا ہوگی یعنی محبت اور اطاعت اور جو ابلیس کا ہے اسے شیطانیت یعنی بغاوت اور نفرت!

***

## ڈاکٹر منور احمد کنڈے

خوفِ رسوائی سے دامن کو بچاتا کیوں ہے
آئینہ دیکھ کے چہرے کو چھپاتا کیوں ہے
تُو تو مختارِ زمانہ تھا یہ کیوں بھول گیا
سامنے ظلم کے گردن کو جھکاتا کیوں ہے
ہر بڑے شہر میں اپنوں کی کمی ہوتی ہے
تُو بڑے شہر میں جاتا ہے تو جاتا کیوں ہے
تجھ کو تعمیرِ نشیمن کا سلیقہ ہی نہیں
برق گرتی ہے وہاں گھر کو بناتا کیوں ہے
جب ترے دل میں کوئی پیار کا جذبہ ہی نہیں
پھر مجھے پیار کا احساس دلاتا کیوں ہے
میری دنیائے محبت کو مٹانے والے
میری تصویر کلیجے سے لگاتا کیوں ہے
اے مرے غم کے محافظ مرے ٹوٹے ہوئے دل
اپنی رودادِ الم سب کو سناتا کیوں ہے

# چند شعراء ادباء کا تعارف

## اکبر حیدرآبادی

لندن و برطانیہ کے معروف شاعر جنہوں نے کئی دہائیوں تک دنیائے ادب پر راج کیا اور ہمیشہ مشاعروں میں اپنے کلام سے داد و تحسین پائی۔ اللہ کی رضا سے 7 اکتوبر 2017 کو برسٹل میں اپنی بیٹی کے گھر انتقال فرما گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کی وقت وصال 92 سال عمر تھی اور کافی مدت سے بیمار تھے۔ قوت سماعت بھی کھو چکے تھے لہٰذا ان سے دو سال سے کوئی رابطہ نہ ہو پایا۔ چند سال پہلے وہ آکسفورڈ سے کیمرج اپنی اہلیہ کے ساتھ شفٹ ہو گئے تھے مگر جب بیماری زیادہ بڑھی تو ان کی بیٹی انہیں برسٹل لے گئی جہاں وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں مقیم تھے۔ جب ان سے بات ہوئی تو وہ اداس لہجے میں کہنے لگے کہ میری ساری کتابیں گھر والوں نے کہیں تلف کر دیں اور اب میرے پاس نہ کچھ لکھنے کو نہ ہی پڑھنے کو ہے۔ بس باقی ماندہ زندگی کے دن خاموشی سے گزارنے ہیں۔۔!!'' ان کی قوت سماعت بھی ختم ہو گئی تھی اور فون پر زیادہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہ ہو پایا... ان کی شاعری میں نہ صرف دولت فکر تھی بلکہ وسعت اور ادراک بھی جو لہجے کی پختگی کی وجہ سے انفرادیت عطا کر گئی تھی۔ انہوں نے غزل کو امتیازی شان عطا کرنے میں کوئی کمی نہیں رکھی اور ہمیشہ اپنی شناخت قائم کرنے کے لئے کبھی کوئی شورشرابہ نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کا نام عزت و احترام اور محبت سے لیا جاتا ہے اور ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ انشاءاللہ۔ کہاں ملیں گے صاحبانِ علم اب... کہ اکبرؔ ایسے لوگ خال خال ہیں۔ مگر اکبر بھائی کی پیری اور بیماری کی وجہ سے ان کی صاحبزادی انہیں اپنے ساتھ برسٹل لے گئی جس کی وجہ سے اب وہ مشاعروں میں بہت ہی کم شرکت کر پاتے تھے ورنہ لندن اور دوسرے شہروں میں اکبر بھائی ضرور شرکت کرتے اور ہمیشہ ہی انہیں انکے حسب مراتب صدارت کی کرسی پیش کی جاتی۔ مرحوم خالد یوسف اور اکبر حیدرآبادی کا ساتھ بہت پرانا تھا دونوں اعلی مقام کے شاعر اور اساتذہ میں شریک ہوتے ہیں خالد یوسف کی کمی آج بھی ادبی حلقوں میں محسوس کی جاتی ہے مگر افسوس آج اکبر بھائی بھی ہم سے جدا ہو گئے جن کی کمی دنیائے ادب کو ہمیشہ رہے گی۔

دور اندیش بلا کا تھا وہ انساں اکبر
آج والوں کو سبق کل کا پڑھایا اس نے

اکبر حیدرآبادی کا پہلا مجموعہ ''خطِ رہگزر جو 1971ء میں، دوسرا مجموعہ ''نمو کی آگ'' جو 1981ء میں، تیسرا مجموعہ ''آوازوں کا شہر'' 1988 میں، چوتھا مجموعہ ''ذروں سے ستاروں تک'' 1993ء میں اور پانچواں مجموعہ کلام'' قرض ماہ و سال 2000 میں منصۂ شہود پر آیا۔ اسکے علاوہ ان کا انگریزی میں نظموں کا مجموعہ ''ری فلیکشن'' شائع ہوا جو میرے علم میں کسی اردو دان کا پہلا انگلش میں مجموعہ ہے۔ اردو کے علاوہ انہیں انگریزی زبان پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے وہ نہایت سنجیدہ، خاموش اور مخلص انسان تھے۔ لندن و برطانیہ کے بے شمار شعرا نے ان سے فیض پایا۔ وہ کبھی کسی کو ناامید نہیں کرتے تھے۔ ماہنامہ ''ساحل'' میں طویل مدت تک وہ رسالے کے مضامین و شاعری پر تنقیدی اور اصلاحی مضامین لکھتے رہے۔ اردو انہی بزرگ ادباء و شعرا کے دم سے اس دیار غیر میں زندہ رہے۔ مگر افسوس کہ یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنی آخری منزل کو رواں دواں ہیں۔ ابھی چند ہفتے قبل سید ریاست عباس رضوی بھی ہمیں داغ جدائی دے گئے اور اب استاد شاعر جناب اکبر حیدرآبادی صاحب۔ موت برحق ہے اور ہم سب نے اپنی اپنی باری پر اسے لبیک کہنا ہے۔ دعا کیجئے کہ مرحومین کو اللہ پاک جنت کے اونچے درجات عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر و جمیل دے آمین۔

## شکیب جلالی

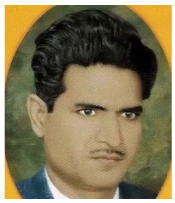

اصل نام۔ سید حسن رضوی۔ یکم اکتوبر 1934ء کو اُتر پردیش کے علی گڑھ کے ایک قصبے سیدانہ جلال میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے شعور کی آنکھیں بدایوں میں کھولیں جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔ لیکن والدہ کی حادثاتی موت نے سید حسن رضوی کے ذہن پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ شکیب جلالی بن گئے۔ انہوں نے 15 یا 16 سال کی عمر میں شاعری شروع کر دی اور شاعری بھی ایسی جو لو دیتی تھی جس میں آتش کدے کی تپش تھی۔ شکیب جلالی پہلے راولپنڈی اور پھر

لاہور آ گئے یہاں سے انہوں نے ایک رسالہ ''جاوید'' نکالا۔لیکن چند شماروں کے بعد ہی یہ رسالہ بند ہو گیا۔ پھر'' پاکستان'' نام کے سرکاری رسالے سے وابستہ ہوئے۔مغربی پاکستان چھوڑ کر کسی اور اخبار سے وابستہ ہو گئے۔

## شکیب جلالی شاعر و ادیب

اردو شاعری میں جب جدید طرز احساس کا شور اُٹھا تو سب سے پہلے یہ بات زیر بحث آئی کہ جدید طرز احساس آخر ہے کیا؟ پھر اس کی جو تعریف کی گئی وہ یہ تھی کہ نیا لہجہ اور نئے مضامین کے امتزاج سے جو شاعری جنم لے اسے جدید طرز احساس کی شاعری کہا جائے گا۔مضامین کے حوالے سے یہ بات کی گئی کہ ان مضامین میں صرف داخلی ہی نہیں بلکہ خارجی عوامل کو بھی شامل کیا جائے۔مراد یہ تھی کہ معروضی صورتحال کو بھی شاعری کا موضوع بنایا جائے۔اس طرح یہ ہوگا کہ موضوعات کے حوالے سے شاعر کا کینوس محدود نہیں بلکہ وسیع ہوگا۔ پھر یہ کہ سیاسی اور معاشی عوامل کو شاعری کا حصہ بنایا جائے۔اس سارے عمل کو (Socio-economic) فیکٹر کہا جاتا ہے۔ انہی شعرا کو جدید شعرا کہا جانے لگا۔شکیب جلالی کا شمار بھی انہی شعرا میں ہوتا ہے۔ یہ صاحب اسلوب شاعر یکم اکتوبر 1934ء کو علی گڑھ کے قریب ایک قصبے جلالی میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔انہوں نے بدایوں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔1950 میں وہ پاکستان آ گئے اور پھر سیالکوٹ سے انہوں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔شکیب جلالی نے لاہور سے بی اے آنرز کی ڈگری لی۔انہوں نے صرف 15 برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔انہوں نے مختلف ملازمتیں کی اور اس سلسلے میں وہ مختلف شہروں میں مقیم رہے۔انہوں نے ایک جریدہ ''جاوید'' بھی شائع کرنا شروع کیا۔لیکن یہ جریدہ کچھ عرصے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک سرکاری رسالے سے وابستہ ہوئے جس کا نام تھا ''مغربی پاکستان''۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شکیب جلالی نے جتنی شاعری کی وہ انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ان کا شعری مجموعہ ''روشنی اے روشنی'' ان کی ناگہانی موت کے چھ برس بعد لاہور سے شائع ہوا جبکہ 2004ء میں ان کے کلام کے کلیات بھی شائع ہوئے۔شکیب جلالی نے 15 برس کی عمر میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ انہوں نے اردو غزل کو نئی جہتوں اور حسن سے آشنا کیا۔ان کا اسلوب جداگانہ تھا۔انہوں نے قطعات اور رباعیاں بھی لکھیں اور پھر تراجم بھی کیے۔شکیب جلالی وہ شاعر ہیں جنہیں اردو شاعری میں وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور بہت حساس طبیعت کے مالک تھے۔وہ جب دس برس کے تھے تو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت نے شکیب کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ والدہ کی جدائی کا غم وہ کبھی نہ بھولے۔ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے 1966ء میں ٹرین کے سامنے کود کر خودکشی کر لی۔ افتخار عارف اور عدیم ہاشمی جیسے شاعروں نے ہمیشہ شکیب جلالی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ بھی اس بات سے متفق تھے کہ شکیب جلالی کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔انہیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔عدیم ہاشمی شکیب جلالی کے بہت بڑے مداح تھے۔وہ شکیب جلالی کے ہم عصر تھے۔عدیم ہاشمی کو خود نظر انداز کیا گیا تھا۔اس لئے ان کے دل میں شکیب جلالی کیلئے بہت نرم گوشہ تھا۔وہ بھی اس بات پر کڑھتے رہے کہ ان کی طرح شکیب کو بھی ناانصافی کی بھینٹ چڑھایا گیا۔عدیم ہاشمی نے ادبی محافل میں ہمیشہ شکیب جلالی کو اردو غزل کا ایک اہم شاعر قرار دیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے رہے کہ بلاشبہ شکیب جلالی جدید طرز احساس کے شاعر ہیں اور ان کا اسلوب انتہائی اعلیٰ ہے۔1979ء میں عدیم ہاشمی پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ صرف شکیب جلالی پر ہی لکھتے ہیں۔ عدیم نے لاہور میں شکیب جلالی کی شاعری کے حوالے سے مشاعرے کا انعقاد کیا۔ چونکہ عدیم نے اس سے پہلے شکیب جلالی کی شاعری پر اتنا کھل کر نہیں لکھا تھا' اس لئے کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ شکیب کے بارے میں لوگ اتنا نہیں جانتے تھے۔عدیم ہاشمی نے جو آخری کتاب لکھی وہ دراصل اقبال' میر اور غالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے تھی۔انہوں نے کتاب کا آغاز ناصر کاظمی اور شکیب جلالی سے کیا۔شکیب جلالی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو ان کی باکمال شاعری کا خزانہ کہیں زیادہ ہوتا۔لیکن شاید ان کی قسمت میں ہی لکھا تھا کہ وہ صرف 32 برس کی عمر میں خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں۔اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان کی شاعری میں آگ کی تپش تھی۔کہا جاتا ہے کہ ان کی موت کے بعد ان کی جیب سے یہ شعر برآمد ہوا۔تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں ...آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ۔ذیل میں ہم اپنے قارئین کی خدمت میں

شکیب جلالی کے کچھ اشعار پیش کر رہے ہیں۔ ان اشعار سے ہی ان کی فنی عظمت کی جھلک دیکھ کر اپنے در و بام لرز اُٹھتا ہوں۔

میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے
میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سن کر لرزہ براندام ہو جائے
گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت جیسا تھا
دنیا کو کچھ خبر نہیں کیا حادثہ ہوا
پھینکا تھا اس نے سنگ گلوں میں لپیٹ کے
اُتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی
اُتر گیا ترے دل میں تو شعر کہلایا
میں اپنی گونج تھا اور گنبدوں میں رہتا تھا
وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت
رہتے ہیں کچھ ملول سے چہرے پڑوس میں
اتنا نہ تیز کیجئے ڈھولک کی تھاپ کو

دیانتداری کی بات یہ ہے کہ شکیب جلالی نے اردو غزل کو بہت کچھ نیا دیا اور اس حقیقت سے انکار سخت ناانصافی ہوگی۔ آخر کب تک شکیب کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا۔ یقین کامل ہے کہ ایک دن شکیب جلالی کو ان کا جائز مقام مل جائے گا۔

**خودکشی:** تعلقاتِ عامہ کے محکمے میں بھی انہیں ایک ذمہ دارانہ ملازمت مل گئی۔ لیکن وہ ان سب چیزوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی شاعری ویسے ہی شعلہ فشانی کرتی رہی اور پھر احساسات کی اس تپش کے آگے انہوں نے سپر ڈال دی اور محض 32 سال کی عمر میں سرگودھا اسٹیشن کے پاس ایک ریل کے سامنے کود کر خودکشی کر لی اور اس طرح شعلوں سے لہلہاتے ہوئے ایک شاعر کا خاتمہ ہوگیا۔ موت کے بعد ان کی جیب سے یہ شعر ملا:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

**نمونہ کلام**

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے
ستارے مشعلیں لے کر مجھے بھی ڈھونڈنے نکلے
میں رستہ بھول جاؤں جنگلوں میں شام ہو جائے
گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت جیسا تھا

## عاصمہ جہانگیر

**ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے**
**بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا**

ایک درخشاں ستارہ، غروب ہوگیا۔ تیغِ براں، غریبوں کی ماں، اقلیتوں کی ڈھارس، جمہوریت کی حامی، عورتوں کے لئے ایک درخشندہ مثال اس دنیا سے باعزت رُخصت ہوگئی۔ ایک آئرن لیڈی کی طرح جیتا جی کر ملک عدم کو سدھاریں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی پہلی عورت صدر بار ایسوسی ایشن، ایک نڈر عورت جس کو دیکھتے ہی ججوں کی زبانیں گنگ ہوجاتی تھیں۔ آمروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ علمائے سُو اس کا سامنا نہ کر سکتے تھے۔ غدار اور منافق ساری عمر اس سے منہ چھپاتے رہے۔ اسے کافرہ کہنے والے، کبھی قادیانی کہنے والے ناکام و نامراد ٹھہرے۔ ظالم اس کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔ مذہب کو ہتھیار بنانے والے اس سے منہ چھپاتے رہے۔ یحییٰ خان کے زمانے میں اس کے والد غلام جیلانی مرحوم پر ناجائز مقدمہ بنانے والے اس ناکردہ گناہ کو عاصمہ جہانگیر کے کھاتے میں ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ شیخ مجیب الرحمن کے رفقائے کار بہت سے تھے کیا وہ پاکستانی نہیں تھے جسٹس حمود الرحمن نے اسی لئے جیلانی صاحب کو رہا کر دیا تھا۔ یہ لوگ ساری زندگی عاصمہ جہانگیر کی شخصیت پر ایک داغ بھی تلاش نہ کر سکے۔ عاصمہ جہانگیر نے ہر مظلوم طبقے کی دادرسی کی۔ فلسطین ہو، کشمیر ہو، روہنگیا ہو، بنگلہ دیش ہو، شام ہو، عراق ہو، پاکستان میں توہین رسالت کے شکار ہوں۔ مرد کے مقابلے میں دو مردوں کی گواہی ہو، یا عورت کے نکاح کے موقع پر ولی کا معاملہ ہو۔ اس نے عورت کو ساری زندگی کبھی تن تنہا نہیں چھوڑا۔ آمر، ظالم طبقات اور علمائے سُو ہمیشہ اس کے مخالف رہے۔ آمریت کو بھی اس نے ہمیشہ کھری کھری سنائیں۔ جمہوریت کی ہمیشہ حامی

رہیں۔اس کے لئے اس نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، ڈنڈے کھائے۔جیلیں کاٹیں۔ایسی بے باک اور نڈر خاتون جو مردِ آہن کی طرح آنکھیں کھول کر سیاسی بھیڑیوں اور درندوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی میں سلام کرتا ہوں اس آئرن لیڈی کو جو ہماری آنے والی آئندہ نسلوں کے لئے ایک لائحہ عمل چھوڑ گئیں۔عاصمہ جہانگیر نے یو این او کے خصوصی نمائندہ کے طور پر بہت سے ممالک کا دورہ کیا فلسطین اور انڈیا میں کشمیر اور مظلوم طبقہ پر ہونے والے مظالم کی قلعی کھولی۔یو این او کو ان پر بہت اعتماد تھا۔محترمہ طاہر جہانگیر ایڈووکیٹ کی بیوی اور مولانا صلاح الدین ایڈیٹر (ادبی دنیا) کی نواسی تھی، علمی اور ادبی، گھرانے سے تعلق تھا۔زرخیز ذہن کی مالک تھی دقیانوسیت سے نالاں تھی، آزادی مذہب، آزادی ضمیر، کی حامی تھیں۔بولنے کا انداز مدلل اور دبنگ تھا۔سچائی اس کا ہتھیار تھا۔بہادر اور دلیر تھیں۔مخالف پر عقاب کی جھپٹنا اس کا شیوہ تھا۔ظالم، غدار، منافق، بے عمل، کرپٹ عناصر کی اس کے نام سے جان جاتی تھی عاصمہ جہانگیر کا سامنا کرتے ہوئے بڑوں بڑوں کے پتّے پانی ہوجایا کرتے تھے۔عاصمہ جہانگیر کو ہر جدوجہد میں سپریم کورٹ، وکلاء اور روشن خیال اور مظلوم طبقات کی ہمیشہ اشیر باد حاصل رہی۔انسانی حقوق، اور مذہبی انتہا پسندی، توہین رسالت کی آڑ میں مظالم کی ہمیشہ مخالف رہیں۔یحییٰ خان کا دور ہو، ضیاء الحق کا، مشرف کا ہو یا کسی بھی ظالم کا وہ حقوق کی جدوجہد میں سب سے منفرد اور نڈر اور بہادری سے مردانہ وار مقابلہ کرنے والی خاتون تھیں۔وہ فاطمہ جناح اور بے نظیر کی طرح بہادر خاتون تھیں۔علمائے سُو اور مکفرین کی ہرزہ سرائی عاصمہ جہانگیر کے آگے دم توڑ چکی تھی۔بڑے بڑے جغادری روایتی ملاں اس کا سامنا تک نہ کر سکے بعض دقیانوسی روایات کو علمائے سُو نے بزعم خود اسلام حصہ بنا لیا ہے مثلاً قرآن سے شادی، عورت کی مرد سے کمتری، قار و قاری، عورت کا حصہ جائیداد میں نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ۔عاصمہ جہانگیر نے اس ڈھونگ کی مخالفت کر کے عورت کو اس کے جائز اسلامی مقام سے آگاہ کیا ہے۔پاکستان میں جو جنگل کا قانون نافذ ہے اور کرپٹ پارلیمنٹ کو ہر شہری کے ایمان کے فیصلہ کرنے کا جو اختیار دے رکھا ہے۔عاصمہ جہانگیر ببانگِ دہل اس کی مخالفت کرتی رہیں اس نے ہر جابر، ظلم، کرپٹ کو ہمیشہ آئینہ دکھایا ہے۔ایسی ہستیاں صدیوں بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔خدا مغفرت کرے عجب نڈر اور دلیر عورت تھی۔

## محسن بھوپالی شاعر و ادیب

اردو کے نامور شاعر تھے۔۱۹۳۲ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان لاڑکانہ آ کر آباد ہو گیا اور پھر حیدرآباد منتقل ہو گیا۔آخر میں وہ کراچی منتقل ہو گئے۔محسن بھوپالی پیشے کے لحاظ سے انجنیئر تھے۔اور سندھ حکومت سے ۱۹۹۱ء میں ایگزیکٹو انجنیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔لیکن ان کی وجہ شہرت شاعری ہی رہی۔دس کتب کے خالق تھے۔ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''شکست شب'' ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد دوسرا مجموعہ ''گرد مسافت'' شائع ہوا۔اس کے علاوہ ''جستہ جستہ'' ''نظمانے'' اور ''ماجرہ'' ان کے قابل ذکر مجموعے ہیں۔۱۹۵۰ء میں ان کو اس وقت شہرت ملی جب تحریک پاکستان کے راہنما عبدالرب نشتر نے ایک جلسے میں ان کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

یہ شعر زبان زدِ عام ہو گیا اور محاورے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔محسن بھوپالی کی شاعری میں ادب اور معاشرے کے گہرے مطالعے کا عکس نظر آتا ہے۔انہوں نے جاپانی ادب کا اردو میں ترجمہ کیا اور ہائیکو (جاپانی شاعری کی ایک قسم) میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کی شاعری کے موضوعات معاشرتی اور سیاسی حالات ہوتے تھے۔ان کے ایک قطعے کو بھی خوب شہرت حاصل ہوئی۔

جاہل کو اگر جہاں کا انعام دیا جائے
اس حادثہ وقت کو کیا انعام دیا جائے
مے خانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے
ہم مصلحت وقت کے قائل نہیں یارو
الزام جو دینا ہو سرِ عام دیا جائے

۱۹۸۸ء ان کے گلے کے سرطان کا کامیاب آپریشن کیا گیا۔اس کے بعد انہیں بولنے میں دشواری ہوتی تھی۔مگر اس کے باوجود بھی انہوں نے زندگی کے معمولات جاری رکھے۔اور مشاعروں میں شرکت کرتے اور شعر پڑھتے رہے۔۱۷ جنوری ۲۰۰۷ء کو کراچی میں نمونیا کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔

# منو بھائی کالم نگار ادیب وشاعر

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
(میر تقی میر)

اگر دنیا میں صحافت کو انسانی شکل وجسم میں آنے کا موقع ملتا تو وہ ہو بہو منو بھائی کی شکل اور قدوقامت کی ہوتی وہ مجسم صحافت اور مجسم انسانیت تھے۔ صحافت وادب کے ہر شعبے پر ان کی مکمل دسترس تھی۔خبر بنانے سے لیکر اداریہ لکھنے تک اور فیچر سے لیکر کالم نگاری تک ہر صنفِ صحافت پر انہیں مکمل عبور تھا شاعری اور پھر ڈرامہ نگاری میں نئے ریکارڈ بنائے۔مگر ان سب سے بڑھ کر وہ اپنی فقیری، قلندری، درویشی، اور صبر وقناعت کی وجہ سے بغض وعناد سے خالی آئیڈیل انسان تھے۔منو بھائی ایک عہد تھا۔فیض کا عہد، احمد ندیم قاسمی کا عہد، اشفاق احمد کا عہد، منیر نیازی اور فراز کا عہد اور آئی اے رحمان کا عہد۔واقعی منو بھائی عہد ساز شخصیت تھے۔ (سہیل وڑائچ)

آپ کا اصل نام منیر احمد قریشی تھا۔آپ ۶ فروری ۱۹۳۳ کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔آپ بہترین کالم نگار، صحافی، اور شاعر وادیب تھے۔آپ ایک منجھے ہوئے انسان تھے۔پنجابی زبان میں بھی آپ نے بہت اچھی شاعری کی ہے۔آپ بہت ہی اچھے مصنف اور رائٹر تھے۔آپ کو صدر پاکستان کی طرف سے پرائیڈ آف پرفارمینس کا ایوارڈ بھی ملا۔آپ بہترین ڈرامہ رائٹر بھی تھے۔ڈرامہ سونا چاندی جو پی ٹی وی پر ۱۹۸۲ میں چلا ان ہی کا شاہکار تھا۔اُن کے چودہ ڈراموں میں ''گمشدہ'' اور ''خوبصورت'' آشیانہ، جزیرہ، جھوک سیال، سونا چاندی بہت ہی مقبول ہوئے۔کالم نگاری میں ان کے امروز اور جنگ میں لکھے گئے کالم پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا تبصرہ ہے جو ہمیں اس ملک پر بیتنے والے خوفناک حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔وہ نہ کسی سے ڈرے اور نہ لے پالک بنے۔منو بھائی SAFMA کے بانی رکن تھے۔وہ پندرہ برس تک اس کے بورڈ آف گورنر کے صدر رہے۔انہوں نے بڑے بڑے نفرت انگیزوں کو محبت کے دو بول بولنے پر مجبور کر دیا۔

انہوں نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنایا۔ساری ساری رات لوگ اُن کی باتیں سنتے بلکہ ان کے انداز تکلم سے دہرے ہوئے ہوئے جاتے۔انہوں نے بچوں کے موذی مرض کے لئے سندس فاؤنڈیشن قائم کیا۔جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا ادارہ بن گیا۔آپ کی مقبول نظم جو زبان زدِ عام ہوئی۔جوتوں چاہنا اے اوہ نئیں ہونا، ہونئیں جاندا، کرنا پیندا، عشق سمندر ترنا پیندا، سکھ لئی دُکھ بھی جرنا پیندا، حق دی خاطر لڑنا پیندا، جیون دے لئی مرنا پیندا۔آپ کا ایک کالم بہت مشہور ہوا جس میں آپ نے ضیاع الحق کو لکھا تھا کہ آپ کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ آپ کے چہرے پر ۸۸ لکھا ہوا ہے جبکہ وہ ۱۹۸۸ء ہی میں اس دنیا سے رُخصت ہوئے۔آپ نے اپنی ذاتی لائبریری کی تمام کتب گورنمنٹ کالج لاہور کو ۲۰۱۴ء میں عطیہ کر دی تھیں۔آپ روزنامہ جنگ سے منسلک رہے۔آپ ۱۹ جنوری ۲۰۱۸ کو ۸۴ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔اللہ تعالیٰ آف کو غریق رحمت کرے۔آمین

## احمد فراز

احمد فراز (4 جنوری 1931 25 اگست 2008) تخلص فراز کمیونسٹ۔پیشہ اردو شاعر لیکچرر۔قومیت پاکستانی۔ نژادیت پشتون سید۔شہریت پاکستانی۔تعلیم ایم اے اردو ایم اے فارسی۔مادر علمی پشاور ماڈل سکول۔جامعہ پشاور۔لکھائی دور 1950 2008۔صِنف اردو غزل۔موضوعات عشق، تحریک مزاحمت۔ادبی تحریک پروگریسو رائٹرز موومنٹ۔ڈیموکریٹک موومنٹ۔نمایاں اعزازات۔ ہلال امتیاز۔ستارہ امتیاز۔نگار ایوارڈ۔اولاد 3 بیٹے: سعدی شبلی اور سرمد فراز۔اہل وعیال سید محمد شاہ برق (والد) سید مسعود کوثر (بھائی) احمد فراز میں کوہاٹ پاکستان میں پیدا ہوئے۔اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ایڈورڈ کالج (پشاور) میں تعلیم کے دوران ریڈیو پاکستان کے لئے فیچر لکھنے شروع کیے۔ جب ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تنہا تنہا'' شائع ہوا تو وہ بی اے میں تھے۔تعلیم کی تکمیل کے بعد ریڈیو سے علیحدہ ہو گئے اور یونیورسٹی میں لیکچر شپ اختیار کر لی۔اسی ملازمت کے دوران ان کا دوسرا مجموعہ ''دردِ آشوب'' چھپا جس کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد پاکستان نیشنل سینٹر (پشاور) کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انہیں 1976ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کا پہلا سربراہ بنایا گیا۔بعد ازاں جنرل ضیاع الحق کے دور میں انہیں مجبوراً جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔آپ 2006ء تک ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کے سربراہ رہے۔ان کا کہنا تھا کہ ٹی وی انٹرویو کی پاداش میں انہیں ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کی ملازمت سے

فارغ کر دیا گیا۔ احمد فراز نے 1988ء میں ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' اور 1990ء میں ''اباسین ایوارڈ'' حاصل کیا۔ 1988ء میں انہیں بھارت میں ''فراق گورکھ پوری ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ اکیڈمی آف اردو لٹریچر (کینیڈا) نے بھی انہیں 1991ء میں ایوارڈ دیا، جب کہ بھارت میں انہیں 1992ء میں ''ٹاٹا ایوارڈ'' ملا۔ انہوں نے متعدد ممالک کے دورے کئے۔ ان کا کلام علی گڑھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ جامعہ ملیہ (بھارت) میں ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا جس کا موضوع ''احمد فراز کی غزل'' ہے۔ بہاولپور میں بھی ''احمد فراز۔ فن اور شخصیت'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا گیا۔ ان کی شاعری کے انگریزی، فرانسیسی، ہندی، یوگوسلاوی، روسی، جرمن اور پنجابی میں تراجم ہو چکے ہیں۔ احمد فراز جنہوں نے ایک زمانے میں فوج میں ملازمت کی کوشش کی تھی، اپنی شاعری کے زمانہ عروج میں فوج میں آمرانہ روش اور اس کے سیاسی کردار کے خلاف شعر کہنے کے سبب کافی شہرت پائی۔ انہوں نے ضیاع الحق کے مارشل لا کے دور کے خلاف نظمیں لکھیں جنہیں بہت شہرت ملی۔ مشاعروں میں کلام پڑھنے پر انہیں ملٹری حکومت نے حراست میں لیا جس کے بعد احمد فراز کو خود ساختہ جلاوطنی بھی برداشت کرنا پڑی۔ سنہ دو ہزار چار میں جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف کے دورِ صدارت میں انہیں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا لیکن دو برس بعد انہوں نے یہ تمغہ سرکاری پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے واپس کر دیا۔ احمد فراز نے کئی نظمیں لکھیں جنہیں عالمی سطح پر سراہا گیا۔ ان کی غزلیات کو بھی بہت شہرت ملی۔

## ابن انشاء

ادیب۔ پیدائشی نام: شیر محمد خان۔ تخلص: انشاء۔ ولادت: 15 جون، 1927ء۔ وفات: 11 جنوری، 1978ء۔ اصناف ادب: شاعری، نثر، ذیلی اصناف غزل، نظم مزاح۔ معروف تصانیف: اردو کی آخری کتاب، چلتے ہو تو چین کو چلئے۔ شاعر، مزاح نگار، اصلی نام شیر محمد خان تھا اور تخلص انشاء۔ آپ 15 جون 1927 کو جالندھر کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور 1953ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ 1962ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ٹوکیو بک ڈویلپمنٹ پروگریم کے وائس چیرمین اور ایشین کو پبلیکیشن پروگریم ٹوکیو کی مرکزی مجلس ادارت کے رُکن تھے۔ روزنامہ جنگ کراچی، اور روزنامہ امروز لاہور کے ہفت روزہ ایڈیشنوں اور ہفت روزہ اخبارِ جہاں میں ہلکے پھلکے فکاہیہ کالم لکھتے تھے۔ دو شعری مجموعے، چاند نگر 1900ء اور اس بستی کے کوچے میں 1976ء شائع ہو چکے ہیں۔ 1960ء میں چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ (چینی نظمیں) شائع ہوا۔ یونیسکو کے مشیر کی حیثیت سے متعدد یورپی و ایشیائی ممالک کا دورہ کیا تھا۔ جن کا احوال اپنے سفرناموں چلتے ہو تو چین کو چلئے، آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا کول ہے، اور ابن بطوطہ کے تعاقب میں اپنے مخصوص طنزیہ و فکاہیہ انداز میں تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اردو کی آخری کتاب، اور خمار گندم ان کے فکاہیہ کالموں کے مجموعے ہیں۔ آپ کا انتقال 11 جنوری 1978 کو ہوا۔

## اختر شیرانی

پیدائش: 1905 وفات: 1948 اردو شاعر، محمد داؤد خان نام ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر لاہور میں گزری۔ والد پروفیسر محمود شیرانی اورنٹل کالج لاہور میں فارسی کے استاد تھے۔ اختر کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کیا لیکن والد کی کوشش کے باوجود کوئی اور امتحان پاس نہ کر سکے اور شعر و شاعری کو مستقل مشغلہ بنا لیا۔ ہمایوں اور سہیلی کی ادارت کے بعد رسالہ انقلاب پھر خیالستان نکالا اور پھر رومان جاری کیا۔ شاہکار کی ادارت بھی کی۔ اردو شاعری میں اختر پہلا رومانی شاعر ہے جس نے اپنی شاعری میں عورت سے خطاب کیا۔ عالم جوانی میں ہی اختر کو شراب نوشی کی لت پڑ چکی تھی، جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوئی۔ لاہور میں انتقال ہوا اور میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

## پروین شاکر

پیدائش 24 نومبر 1952ء کراچی سندھ پاکستان۔ وفات 26 دسمبر 1994 (عمر 42 سال) اسلام آباد پاکستان۔ پیشہ: اردو شاعر۔ قومیت: پاکستانی نژادیت: اردو۔ تعلیم ایم اے انگریزی ادب، بینک ایڈمنسٹریشن پی ایچ ڈی۔ صِنف غزل آزاد نظم۔ نمایاں کام: خوشبو۔ نمایاں

**اعزازات:** صدارتی تمغہ حسن کارکردگی۔آدم جی اعزاز۔زوج: سید نصیر علی۔اولاد: سید مراد علی۔ پروین شاکر کو اُردو کی منفرد لہجے کی شاعرہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں وہ شہرت حاصل ہوئی جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہو پاتی ہے۔ابتدائی حالات۔ ۲۴ نومبر 1954ء کو پاکستان کے شہر کراچی میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد کا نام سید شاکر حسن تھا۔ان کا خانوادہ صاحبان علم تھا۔ان کے خاندان میں کئی نامور شعرا اور ادبا پیدا ہوئے۔جن میں بہار حسین آبادی کی شخصیت بہت بلند و بالا ہے۔آپ کے نانا حسن عسکری اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے انہوں بچپن میں پروین کو کئی شعراء کے کلام سے روشناس کروایا۔ پروین ایک ہونہار طالبہ تھیں۔ دورانِ تعلیم وہ اردو مباحثوں میں حصہ لیتیں رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ریڈیو پاکستان کے مختلف علمی ادبی پروگراموں میں شرکت کرتی رہیں۔انگریزی ادب اور زبانی دانی میں گریجویشن کیا اور بعد میں انہی مضامین میں جامعہ کراچی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پروین شاکر استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہیں اور پھر بعد میں اپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

**حالات زندگی:** سرکاری ملازمت شروع کرنے سے پہلے نو سال شعبہ تدریس سے منسلک رہیں، اور 1986ء میں کسٹم ڈیپارٹمنٹ، سی۔بی۔آر اسلام آباد میں سیکرٹری دوئم کے طور پر اپنی خدمات انجام دینے لگیں۔1990 میں ٹرینٹی کالج جو کہ امریکہ سے تعلق رکھتا تھا تعلیم حاصل کی اور 1991ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ پروین کی شادی ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی جس سے بعد میں طلاق لے لی۔ادبی خدمات۔شاعری میں آپ کو احمد ندیم قاسمی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی۔آپ کا بیشتر کلام اُن کے رسالے فنون میں شائع ہوتا رہا۔

**تخلیقات۔**ان کی شاعری کا موضوع محبت اور عورت ہے۔خوشبو (1976ء)، صد برگ (1980ء )، خود کلامی (1990ء )،انکار (1990ء)ماہ تمام(1994ء)

**تاثرات:** پروین شاکر کی پوری شاعری ان کے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ہے جو درد کائنات بن جاتا ہے اسی لئے انہیں دور جدید کی شاعرات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔حالانکہ وہ یہ بھی اعتراف کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں کشور ناہید، پروین فنا سید، فہمیدہ ریاض کو پسند کرتی ہیں،لیکن ان کے یہاں احساس کی جو شدت ہے وہ ان کی ہم عصر دوسری شاعرات کے یہاں نظر نہیں آتی۔اُن کی شاعری میں قوس قزح کے ساتوں رنگ نظر آتے ہیں۔اُن کے پہلے مجموعے خوشبو میں ایک نوجوان دوشیزہ کے شوخ و چنگ جذبات کا اظہار ہے اور اس وقت پروین شاکر اسی منزل میں تھیں۔زندگی کے سنگلاخ راستوں کا احساس تو بعد میں ہوا جس کا اظہار ان کی بعد کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ماں کے جذبات شوہر سے ناچاقی اور علیحدگی، ورکنگ وومن کے مسائل ان سبھی کو انہوں نے بہت خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔وفات۔دسمبر 1994ء کو ٹریفک کے ایک حادثے میں اسلام آباد میں، بیالیس سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملیں۔لواحقین میں ان کے بیٹے کا نام مراد علی ہے۔

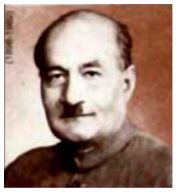

## جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی (پیدائش: ۵ دسمبر 1898ء، وفات: ۲۲ فروری 1983ء) پورا نام شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی اردو ادب کے نامور اور قادرالکلام شاعر تھے۔آپ آفریدی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

**ابتدائی حالات:** آپ ۵ دسمبر 1898ء کو اُتر پردیش ہندوستان کے مردم خیز علاقے ملیح آباد کے ایک علمی اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے چند برسوں بعد ہجرت کر کے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جوش نہ صرف اپنی مادری زبان اردو میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ آپ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔اپنی اِسی خداداد لسانی صلاحیتوں کے وصف آپ نے قومی اردو لغت کی ترتیب و تالیف میں بھرپور علمی معاونت کی۔نیز آپ نے انجمن ترقی اردو (کراچی) اور دارالترجمہ (حیدرآباد دکن) میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔22 فروری 1983ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

**تصانیف:** آپ کثیر التصانیف شاعر و مصنف تھے۔آپ کے شعری مجموعوں اور تصانیف میں مندرجہ ذیل نام اہم ہیں۔رُوحِ ادب،آوازہ حق،شاعر کی راتیں،جوش کے سو شعر،نقش و نگار،شعلہ و شبنم،پیغمبر اسلام،فکر و نشاط،جنوں و حکمت،حرف و حکایت،حسین اور انقلاب،آیات و نغمات،عرش و فرش، رامش و رنگ،سنبل و سلاسل،سیف و سبو،سرور و خروش،سموم و

سبا،طلوع فکر،موجد و مفکر، قطرہ قلزم،نوادر جوش،الہاموافکار،نجوم و جواہر۔ جوش کے مرثیے۔عروس ادب (حصہ اول و دوم) عرفانیات جوش،محراب و مضراب،دیوان جوش۔

نثری مجموعے: مقالات جوش،اوراق زرّیں،جذبات فطرت،اشارات، مقالات جوش،مکالمات جوش، یادوں کی بارات (خودنوشت سوانح)

## جگر مرادآبادی

آپ کا تخلص ''جگر مرادآبادی'' تھا۔ بھارت کی ریاست اتر پردیش کے شہر مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ اردو کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ آپ 6 اپریل 1898ء کو مرادآباد میں پیدا ہوئے۔آپ بیسویں صدی کے اردو کے مشہور شاعروں میں سے ایک ہیں۔آپ کو سب سے زیادہ نظموں کو جمع کرنے پر ایوارڈ ملا۔آپ کم عمر میں ہی اپنے والد سے محروم ہو گئے اور آپ کا بچپن آسان نہیں تھا۔آپ نے مدرسے سے اردو اور فارسی سیکھی۔شروع میں آپ کے شاعری کے استاد رسا رامپوری تھے۔آپ غزل لکھنے کے ایک سکول سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کا 9 ستمبر 1960ء کو انتقال ہو گیا۔گونڈا میں ایک رہائشی کالونی کا نام آپ کے نام پر' جگر گنج' رکھا گیا ہے۔وہاں ایک سکول بھی آپ کے نام پر جگر میموریل انٹر کالج رکھا گیا ہے۔

## حبیب جالب

مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب ایک شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ آمریت کے خلاف اور غیر جمہوری حکومتوں کے بارے ایک سنگ میل بھی ہیں جن کے بارے میں ہم سب کو پڑھنا چاہیے تا کہ معلوم ہو سکے کہ حبیب جالب نے کس طرح خلوص اور بہادری سے عوام کے جمہوری، سماجی، سیاسی حقوق کی پاسداری کی اور خلوص اور بہادری سے سامراجی قوتوں اور ان کے دلال سیاستدانوں کا مقابلہ کیا اور ہر دور میں عتاب کا نشانہ بنے۔

سوانح۔ابتدائی حالات: اردو شاعر حبیب جالب 1928ء میں دسوہہ ضلع ہوشیار پور ''بھارتی پنجاب'' میں پیدا ہوئے۔اینگلو عربک ہائی سکول دہلی سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول جیکب لائن کراچی سے مزید تعلیم حاصل کی، روزنامہ جنگ اور پھر لائلپور ٹیکسٹائل مل سے روزگار کے سلسلے میں منسلک ہوئے۔

حالات زندگی: پہلا مجموعہ کلام برگِ آوارہ کے نام سے 1957 میں شائع کیا،مختلف شہروں سے ہجرت کرتے ہوئے بالآخر لاہور میں مستقل آباد ہو گئے اور ان کا یہ شعر ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔آزادی کے بعد کراچی آ گئے اور کچھ عرصہ معروف کسان رہنما حیدر بخش جتوئی کی سندھ ہاری تحریک میں کام کیا۔ یہیں ان میں طبقاتی شعور پیدا ہوا اور انھوں نے معاشرتی ناانصافیوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔1956ء میں لاہور میں رہائش اختیار کی۔

سیاسی حالات زندگی: ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور آمریت میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ جالب کو 1960 کے عشرے میں جیل جانا پڑا اور وہاں انہوں نے کچھ اشعار لکھے ''سرِ مقتل'' کے عنوان سے جو حکومتِ وقت نے ضبط کر لیئے لیکن انہوں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ جالب نے 1960 اور 1970 کے عشروں بہت خوبصورت شاعری کی جس میں انہوں نے اس وقت کے مارشل لا کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔اکتوبر 1999 میں جب اس وقت کے حکمراں جنرل پرویز مشرف نے ایمرجنسی لگائی تو مشرف کے سیاسی مخالفین کے جلسوں میں حبیب جالب کی شاعری دلوں کو گرمانے کے لیے پڑھی جاتی تھی۔

کارہائے نمایاں:: 1958 میں پہلا آمریت کا دور شروع ہوا 1962ء میں اسی ایوبی آمریت نے نام نہاد دستور پیش کیا جس پر جالب نے اپنی مشہور زمانہ نظم کہی جس نے عوام کے جم غفیر کے جذبات میں آگ لگا دی۔میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا 1970ء کے انتخابات کے بعد جنرل یحییٰ خان نے اقتدار اکثریتی پارٹی کو منتقل نہیں کیا اور اس کے جواب میں ان پر گولیاں برسائیں اس وقت مغربی پاکستان اس فوج کشی کی حمایت کر رہا تھا اس وقت یہ جالب صاحب ہی تھے جو کہے رہے تھے۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو۔وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے۔یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

۱۹۷۴ء میں وزیر اعظم بھٹو جن کے کندھوں پے بیٹھ کر مسند اقتدار پر پہنچے تھے ان سب کو نام نہاد حیدر آباد سازش کیس میں بند کر دیا، اسی دور میں

جالب صاحب کی یہ نظم بہت مشہور ہوئی: قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا، لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو ضیاء الحق کے مارشل لاء میں جب حیدرآباد سازش کیس ختم ہوا اور اس کے اسیروں کو رہائی ملی تو انہوں نے اوروں کی طرح بھٹو دشمنی میں نہ ہی ضیاء الحق سے ہاتھ ملایا اور نہ ہی فسطائیت کے ترانے گائے بلکہ انہوں تو کہا:

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

آمریت کے بعد جب پیپلز پارٹی کا پہلا دور حکومت آیا اور عوام کے حالات کچھ نہ بدلے تو جالب صاحب کو کہنا پڑا:

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھریں ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

تخلیقات: صراط مستقیم ذکر بہتے خوں کا، گنبدِ بیدار، کلیات حبیب جالب اس شہرِ خرابی میں، گوشے میں قفس کے، حرفِ حق، حرفِ سرِ دار، احادِ ستم۔

فلمی کام: انہیں مشہور پاکستانی فلم زرقا میں 'رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے' لکھنے پر شہرت حاصل ہوئی۔

تاثرات: ابتدا میں جگر مراد آبادی سے متاثر تھے اور روایتی غزلیں کہتے تھے۔ حبیب جالب کی سیاسی شاعری آج بھی عام آدمی کو ظلم کے خلاف بے باک آواز اُٹھانے کا سبق دیتی ہے۔ حبیب جالب کی پوری زندگی فقیری میں گذری۔ اپنی زندگی میں حکومتی مخالفتوں کے ساتھ ساتھ عوامی حمایت کا بھی ایک جم غفیر ان کے ساتھ تھا۔ جن میں ہر شعبہ زندگی کے لوگ شامل تھے۔ جن سے آپ کسی نہ کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر انہوں نے ایک معمولی سا فائدہ نہ اپنی ذات کے لیے اُٹھایا اور نہ اپنے اہل خانہ کو کچھ حاصل کرنے دیا۔ ان کے بچے معمولی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر کے جوان ہوئے۔

اعزازات: ان کو نگار فلمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 2006ء سے ان کے نام سے حبیب جالب امن ایوارڈ کا اجراء کیا گیا۔ آخری ایام۔ ان کا انتقال 12 مارچ 1993ء کو ہوا۔

مزید برائے مطالعہ: حبیب جالب امن ایوارڈ۔ بیرونی روابط۔ دیوان عام از کالم نگار سعید پرویز' جالب جالب کہتے ہیں''کلیات حبیب جالب'' جالب'' مصنفہ از مجاہد بریلوی۔



## حفیظ جالندھری

تخلص: ابوالاثر۔ پیدائش: 14 جنوری 1900۔ جالندھر پنجاب برطانوی تسلط ہندوستان۔ وفات: 21 دسمبر 1982 (عمر 82 سال) لاہور پنجاب پاکستان۔ پیشہ : اردو شاعر۔ قومیت : پاکستانی۔ صِنف : غزل۔ موضوعات حُب الوطنی فلسفہ۔ ادبی تحریک تحریک پاکستان نمایاں کام: قومی ترانہ کا خالق۔ شاہنامہ اسلام۔ نمایاں اعزازات: تمغہ حسنِ کارکردگی۔ ہلال امتیاز۔ زوج : زینت بیگم۔ خورشید بیگم اہل وعیال : شمس الدین (والد) ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر اور نثر نگار تھے۔ آپ 14 جنوری 1900ء کو پیدا ہوے۔ آپ کا قلمی نام ابوالاثر تھا۔ پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق کی حیثیت سے شہرتِ دوام پائی۔ ہندوستان کے شہر جالندھر میں 14 جنوری 1900ء کو پیدا ہوئے۔ آزادی کے وقت 1947ء میں لاہور آ گئے۔ آپ نے تعلیمی اسناد حاصل نہیں کیں، مگر اس کمی کو انہوں نے خود پڑھ کر پوری کیا۔ انہیں نامور فارسی شاعر مولانا غلام قادر بلگرامی کی اصلاح حاصل رہی۔ اپ نے محنت اور ریاضت سے نامور شعرا کی فہرست میں جگہ بنالی۔ 21 دسمبر 1982 کو آپ وفات پا گئے۔ اس وقت آپ کی عمر 82 سال تھی۔



## حفیظ تائب

تعارف: مشہور نعت گو شاعر، مجدد نعت حفیظ تائب 14 فروری 1931 کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن احمد نگر ضلع گوجرانوالہ ہے۔ آپ کا اصل نام عبدالحفیظ ہے۔ 1974 میں آپ نے جامعہ پنجاب سے ایم اے پنجابی کیا اور 1976 تا 1993 پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں تدریس کرتے رہے۔ ان کا شمار پاکستان میں نعت گوئی کو فروغ دینے والے بانی شعراء میں ہوتا ہے۔ انہیں نعت کے ایک اعلیٰ پایہ کے محقق اور تنقید نگار کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ فروغِ نعت کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا اس کے علاوہ انہیں نقوش ایوارڈ، آدم جی ایوارڈ، ہمدرد فاؤنڈیشن ایوارڈ سمیت کئی ایوارڈ

دیئے گئے۔وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پنجابی میں بھی بطور پروفیسر خدمات انجام دیتے رہے۔کینسر کی عارضے کی وجہ سے لاہور میں انتقال ہوا۔

تصانیف: آپ کی تصنیف کردہ کتب کی فہرست۔۔صلوعلیہ وآلہ،اُردو مجموعہ نعت،صلوعلیہ والہ 1978 میں شائع ہوئی اوراس کوآدم جی ادبی ایوارڈ بھی دیا گیا۔اس کا تجزیہ ڈاکٹر سید عبداللہ،مقدمہ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں اور فلیپ احسان دانش،احمد ندیم قاسمی،ڈاکٹر وحید قریشی،مولانا محمد بخش مسلم،سید نذیر نیازی،میرزاادیب،حافظ محمد افضل فقیر،حافظ مظہر الدین مظہراور حافظ لدھیانوی نے لکھا ہے۔سک متراں دی،پنجابی مجموعہ نعت،سک متراں دی، 1978 میں شائع ہوئی اور اسے پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ دیا گیا۔وسلموا تسلیما،پنجابی مجموعہ نعت۔وسلموا تسلیما 1990 میں طبع ہوئی اوراس کتاب کو تصنیف کرنے پر وزارت مذہبی امور پاکستان کی طرف حفیظ تائب کو صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔وہی یسٰیں وہی طہ،اردو مجموعہ نعت،مناقب،اردو مجموعہ منقبت،لیکھ،(پنجابی حمد،نعت،غزل اور گیت پر مشتمل)،کوثریہ،اردو مجموعہ نعت نصب،اردو مجموعہ غزل،تعبیر،اردو قومی و ملی منظومات،تحقیق و تدوین وتنقید۔

## احمد ندیم قاسمی ذات وصفات

علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے بعد برصغیر ہندو پاک میں اگر کسی بڑے شاعر،ادیب،صحافی افسانہ نگاراور کالم نویس کا نام معلوم کیا جائے تو یقیناً لوگوں کی زبان پر بے ساختہ احمد ندیم قاسمی کا نام آئے گا۔اُردو کے اس عظیم شاعر ادیب،افسانہ نگر،صحافی نقاد پر لاتعداد مضامین و کتب تحریر ہو چکے ہیں۔کتنی ہی یونیورسٹیز میں ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات سپرد قلم ہو چکے ہیں۔ان کی غزلوں نظموں اور افسانوں کو یونی ورسٹیز کے کورس میں شامل طلبا کو پڑھایا جاتا ہے۔ساتھ ہی ان کے فن پارے ہندی روسی جاپانی اور چینی اور انگریزی زبانوں میں تارجم ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔کئی اخبارات و رسائل میں ان کی ادبی جہات پر خصوصی گوشے نکل چکے ہیں۔احمد ندیم قادسی برصغیر کے واحد قلم کار ہیں جو بیک وقوت شاعر افسانہ نگار خاکہ نگار بچوں کے ادیب،مدیر،نقاد، صحافی اور کالم نگار ہیں۔2016 میں احمد ندیم قاسمی کی صد سالہ تقریب منا رہے ہیں۔ان کی شخصیت ایک عہد ساز ادیب کی ہے۔احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے نمائندہ ادیب ونقاد تھے۔تا حیات وہ اس تحریک کی فکر ونظر سے متاثر رہ ے۔احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس تحریک سے متاثر ہو کر انہوں نے جو اکتسابی ادب تخلیق کیا،اور اپنے فن میں جو بلند آہنگ پیدا کیا،اس کے بارے میں ڈاکٹر سدید نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا۔لکھتے ہیں ''ندیم کے یہاں ترقی پسندی رویہ اکتسابی ہے۔ ''دھڑکنیں'' کے قطعات ان کا مزاج رومانی ہے لیکن ترقی پسند تحریک نے انہیں بلند آہنگ ہونے پر مائل کیا۔چنانچہ ان کے ہاں دو لہجے پیداہ ہو گئے۔ ایک لہجہ ان کی فکری رقّت کا غمازہ تھا۔دوسرا غیر معمولی EUOPHORIA سے ہمکنار ہے۔صدیق کلیم کے خیال میں ''قاسمی اس کوشش میں رہتا ہے۔ کہ ذہن کو ماورائیت سے مادیت کی طرف رُجوع کرے۔لیکن ان کی شاعری کی کمزوری نہیں بلکہ کہ قوت ہے'' معروضیت ندیم کے فن میں قیمتی عنصر ہے اور یہ ان کی موضوعاتی نظموں میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔''

(اُردو اب کی مختصر تاریخ صفحہ 444،ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی،2013ء)

احمد ندیم کی وفات کے بعد پاکستانی ادب کی معمار سیریز کے تحت ''احمد ندیم قاسمی شکصیت اور فن'' نامی کتاب کو 2009ء میں ان کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی نے ترتیب دیا۔یہ کتاب قاسمی کے ادبی کارناموں کا دستاویز ہے۔اس کتاب کے پیش نامے میں احمد ندیم قاسمی کی ادبی جہات اور کارناموں کے بارے میں نگران اعلیٰ فخر زمان تحریر کرتے ہیں۔''احمد ندیم قاسمی کی دنیا میں ایک عہد ساز ادیب کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کی بطور ادیب کئی جہتیں ہیں۔شاعر کے طور پر انہوں نے ادب کو گراں قدر شاعری کے گراں قدر مجموعے دیئے۔افسانہ نگار کی حیثیت سے اُن کے متعدد مجموعے افسانوی ادب میں مسلم کی اہمیت رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحب اسلوب کالم نگار کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔اُن کی ایک اور انفرادیت بطور مدیر ''فنون'' کی ہے وہ نہ صرف ''فنون'' کے مدیر رہے بلکہ ''ادب لطیف'' اور نقوش کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں غزلیں اقبال اور فیض کی شعری روایت کے بعد بہت اہم گردانی جاتی ہیں۔ انہوں نے افسانوی ادب میں لازوال کہانیاں تحریر کی ہیں۔ان کی تنقیدی اور سوانحی تحریریں بھی اردو ادب میں حوالے کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی گراں قدر ادب تخلیق کیا۔اُن کے کالم ہماری

معاشرتی زندگی کے بھرپور عکاس ہیں اور اُن سے پاکستان کی معاشرت اور سیاست کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔'' (پاکستانی ادب کے معمار پیش نامہ صفحہ 7 تا 8 اسلام آباد 2009ء) احمد ندیم قاسمی کی ولادت 20 نمبر 1916ء کو غیر منقسم ہندوستان کے گاؤں انگہ وادی سون سکیسر، ضلع خوشاب پنجاب کے ایک قبیلہ اعوان میں ہوئی۔ ان کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ اپنے پردادا محمد قاسم کی رعایت سے ''قاسمی کہلائے'' ان کے والد پیر غلام نبی اور والدہ غلام بیوی تھیں۔ احمد ندیم قاسمی کی تعلیم کی ابتدا قرآن کریم سے گاؤں کی مسجد میں ہوئی۔ 1931ء میں انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1933ء میں انٹر میڈیٹ اور 1935ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ احمد ندیم قاسمی انگریزی سے ایک ایم اے کرنا چاہتے تھے لیکن مالی حالت خستہ ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ کالج لاہور کی فیس ادا نہ کر سکے اور ایم اے کرنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ 1936ء میں انہوں نے پہلا افسانہ ''بدنصیب بت تراش'' تخلیق کیا جو رسالہ ''رومان'' میں شائع ہوا۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی پہلی ملازمت 1936ء میں ریفارمز کمشنر لاہور میں بہ طور محرر کی۔ اس کی بعد انہوں نے مختلف ادارہ جات میں خدمات انجام دیں۔ ملتان میں ایکسائز سب انسپکٹر رہے۔ ریڈیو پاکستان پشاور میں بہ حیثیت اسکرپٹ رائٹر کام کیا (خیال رہے کہ ادارہ تقسیم ہند سے قبل آل انڈیا ریڈیو کا حصہ تھا) ''بزم اقبال'' کے اعزازی سیکریٹری بھی رہے اور مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی خدمات انجام دیں۔ صحافت میں دلچسپی ہونے کے سبب ''تہذیب نسواں'' اور پھول نامی جریدوں کے ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اس کے بعد حاجرہ مسرور اور خدیجہ مسرور کے ساتھ مل کر ''نقوش'' کی ادارت بھی سنبھالی۔ اس کے علاوہ ''ادب لطیف'' ''سویرا'' ''سحر'' ''امروز'' ''اقبال'' ''صحیفہ'' اور رسالہ فنون (یہ ان کا ذاتی رسالہ تھا۔ 1963ء میں اس کا جراء کیا گیا۔) میں بھی اپنے کارہائے نمایاں ادا کئے گئے۔ احمد ندیم قاسمی پر حکومت ہند کا عتاب کئی بار ٹوٹا۔ حکومت پاکستان نے قاسمی صاحب کو SAFTY ACT کے تحت 1951ء اور 1959ء میں گرفتار بھی کیا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود قاسمی صاحب نے اپنے قلم کے جوہر اردو ادب کی ہر اصناف میں دکھائے۔ قاسمی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ''نثری ادب'' سے کیا تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چوپال'' 1939ء میں منظر عام پر آیا تھا اس کے بعد 1941ء میں ''بگولے''، 1942ء میں ''طلوع غروب''، 1943ء میں ''گرداب'' 1944ء میں سیلاب، 1945ء میں ''آنچل'' 1946ء میں ''آبلے''، 1948ء میں ''آس پاس'' 1949ء میں ''درودیوار'' 1952ء میں ''سناٹا''، 1955ء میں ''بازار حیات''، 1959ء میں ''برگ حنا'' 1961ء میں ''سیلاب و گرداب'' 1963ء میں گھر سے گھر تک''، 1973ء میں ''کپاس کا پھول'' 1980ء میں نیلا پتھر''، 1995ء میں ''کوہ و پیما''، 2007ء میں ''پت جھڑ'' (افسانے اور ناولٹ) نے شائع ہو کر قبول عام کی نئی منازل طے کیں۔ احمد ندیم قاسمی نے شاعری کی میدان میں قدم مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھ کر رکھا۔ اس نظم کی بہت پذیرائی ہوئی۔ یہ نظم روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوئی۔

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تا جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی، حمد، نعت سلام غرض یہ کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری میں شدید احساس، حالات کا صحیح تجزیہ، حیات انسانی کی حقیقی ترجمانی، خلوص وصداقت اور اسلوب کی پختگی نمایاں ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی شاعری کے لئے مواد اردگرد سے لیا۔ کیوں کی ان کا بچپن خستہ حالی میں گزرا تھا۔ پریشان حال لوگوں کے جذباتوں کی نمائندگی انہوں نے اپنی شاعری میں کی۔ اس غزل سے ان کے جذبات واحساسات اور میری بات کی تائید ضرور ہو جائے گی۔

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقاء کا تھا
اس رشتہء لطیف کے اسرار کیا کھلیں
تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا
ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زَد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
چھپ چھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا
دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی

یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا
اس حسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی وہ تقاضا وفا کا تھا
حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیمؔ
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

''قاسمی کو نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ افسانہ نگاری میں بھی ان کا رُتبہ بلند ہے لیکن یہاں ان کی شاعری کے بارے میں گفتگو مقصود ہے۔ قاسمی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بھی حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ ان کا شمار پیامی شاعروں میں ہے لیکن ان کا کلام نثریت اور خطابیت جیسے عیبوں سے پاک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے غریبی کا درد خود سہا ہے۔ اس لئے ان کی حمایت میں جو کچھ کہتے ہیں محسوس کر کے کہتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ درد میں وہ اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ شعری وسائل سے وہ بہت سلیقے کے ساتھ کام لیتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو صفحہ 220 ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 2011ء)

جب احمد ندیم قاسمی ادبی اُفق پر طلوع ہوئے تھے۔ اُس وقت ادنی فضاؤں میں سجاد وحید یلدرم، نیاز فتح پوری، اور اختر شیرانی کی رنگین مزاج مگر سطحیت زور رومانیت کا بال بالا ہر سو تھا۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی کا مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے متاثر ہو کر اشعار کہنا اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ احمد ندیم قومی اور بین الاقوامی مصائب سے گہری واقفیت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کی شعری جہت فہم اور ادراک پر تبصرہ کرتے ہوئے رفعت سروش رقم طراز ہیں۔''احمد ندیم غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے سروکار، بہترین زندگی کی جدو جہد اور عصری تہذیب کے لئے ناقدانہ رویہ ہے۔'' (ماہنامہ اردو دنیا صفحہ 25 نئی دہلی ستمبر 2006ء)

احمد ندیم قاسمی نے مقامی سطح پر ہونے والے واقعات کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا۔ وہ اپنی بات کو ببانگ دُہل کہتے تھے۔ جب پاکستان کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہو گئے اور وہاں پر ایمرجنسی نافذ ہوگئی۔ اور انسانی حقوق کی پامالی سرِ عام کی گئی۔ تو ایسے سنگین اور نازک حالات و ماحول میں احمد ندیم قاسمی نے بہ ذریعہ قلم فوجی حکمرانوں کا مقابلہ کیا۔ ایک غیرت مند اور غیور ادیب ان پابندیوں کو کب تک برداشت کرتا۔ کیوں کہ احمد ندیم قاسمی نے قلم پر لگائی پابندی کو بہ ذات خود قد جھیلا تا حکومت وقت کے خلاف لکھنے پر وہ دو مرتبہ جیل جا چکے تھے۔ لیکن ان کا قلم ان ظلم کے خلاف اور انسانیت کی بقا اور وجود کے لئے بول اُٹھا۔ بولنے سے مجھے کیوں روکتے ہو، بولنے دو کہ میرا بولنا دراصل گواہی ہے میرے ہونے کی، تم نہیں بولنے دو گے تو میں سناٹے کی بولی میں ہی بول اُٹھوں گا، میں تو بولوں گا، نہ بولوں گا تو مرجا اُں گا، بولنا تو صرف ہے میرا، کبھی اس نکتے پر بھی غور کیا ہے تم نے، کہ فرشتے بھی نہیں بولتے، میں بولتا ہوں، اگرچہ احمد ندیم قاسمی کے اصل شاعرانہ جوہر ان کی نظموں میں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے غزلیں بھی ایسی کہی ہیں جو اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کو جتنی مقبولیت شاعری میں تھی اُس نے کہیں زیادہ اُن کے افسانے بھی مقبول تھے۔ قاسمی صاحب کا اردو افسانہ نگاری میں منفرد مقام و مرتبہ ہے۔ اردو میں انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک افسانے تخلیق کئے۔ جو شاہکار کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے کئی افسانے کلاسیکل افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔''رئیس خانہ''''گھر سے گھر تک'' ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد''''مامتا'' ''کپاس کا پھول'' پرمیشر سنگھ'' گنڈاسا''سناٹا'' ''چوپال'' '' وحشی ''''سلطان'' وغیرہ افسانے اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر دیہات کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پاکستان کے دیہاتی زندگی کے مسائل قاسمی صاحب نے مہذب طریقے سے قاری کے سامنے رکھا۔ اردو افسانہ نگاری میں پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت کے ساتھ ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگاری کی بدولت ہی انہیں ایک لیجینڈ کا درجہ دیا گیا۔ سید وقار عظیم نے احمد ندیم قاسمی کی فن نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔''ندیم کی انفرادیت اور یگانگت بہ حیثیت انسان اور اس کی انفرادیت اور یگانگت بہ حیثیت فن کار، ترازو کے دونوں پلڑوں کو یوں ایک سطح پر لے آتی ہے کہ وہ انسان بھی عظیم تر ہی نظر آتا ہے اور فن کار بھی، اس کی وجہ میری اپنی نظر میں یہ ہے کہ ندیم جو باطن میں ہے وہ ظاہر میں بھی ہے اور جو اُس کا ظاہر ہے اس کا باطن بھی ہے۔ کوئی مجھ سے ندیم کے زیر بحث افسانوں کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گا ان کی کہانیاں زندگی کے زہر اور اس کے تریاق کی کہانیاں ہیں اور ان کی کہانیاں انسانیت اور فن کی بہترین قدروں کی غیر واعظاتی تلقین کی کہانیاں ہیں۔''

(ندیم کے افسانے سناٹا کے بعد صفحہ 270 اور 290 ندیم نامہ، (محمد طفیل اور بشیر موجد) لاہور پاکستان 1976ء)

احمد ندیم قاسمی ایک نیک دل اور دردمند انسان تھے۔اس بات کا علم ہمیں ان کے لکھے خطوط سے ہوتا ہے۔ادبی رسائل وجرائد کی ادارت کرتے ہوئے ان کے تعلق دنیا بھر کے ادیبوں سے ہو گئے۔ادیبوں کو خطوط لکھنا، پھر ان کے خطوط کا جواب دینا ادبی فرض کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری بھی تھی۔ ان خطوط میں قاسمی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔نئی نسل کو ادب میں روشناس کرانے میں ان کا اہم کردار رہا۔جن ادبی شخصیتوں کے نام قاسمی صاحب نے خطوط تحریر کئے ان میں سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، عبادت بریلوی، شمس الرحمان فاروقی، مشفق خواجہ، خورشید ربانیر، فتح محمد ملک، خواجہ عبیدہ الرحمٰن طارق، اختر شاہجہاں پوری اور رشید حسن خان کے اسماء سرفہرست ہیں۔اپنی ان باتوں کی تصدیق کے لئے میں قاسمی صاحب کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی کا اعتراف نامہ تحریر کر رہا ہوں۔''ندیم صاحب واقعی درویش صفت انسان تھے۔وہ زندگی اور اُس کے حسن کے قدر دان تو تھے لیکن اُنہیں زیادہ کا حرص اور عیش وآرام کا لالچ نہیں تھا، جب کہ وہ ضروریات زندگی خود اپنے دستِ محنت سے پوری کر لیتے۔وہ کبھی جھینپتے نہیں تھے لیکن اپنا کچھ جھینپنے نہیں دیتے تھے۔یہ الگ بات ہے کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہا بانٹ دیا۔وہ اُن کا قیمتی وقت ہی کیوں نہ تھا، کیوں کہ اُن کا پختہ یقین اس بات میں تھا کہ سکھ سب میں برابر تقسیم ہونا چاہیئں۔

(احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن ڈاکٹر ناہید قاسمی
صفحہ 14 اکاڈمی ادبیات پاکستان اسلام آباد 2009ء)

## ثاقبؔ زیروی

نام محمد صدیق ولد حکیم مولوی اللہ بخش قوم راجپوت وطن زیرہ ضلع فیروز پور (بھارت) تاریخ پیدائش ۱۱/اپریل ۱۹۱۹ء تاریخ وفات ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء بمقام لاہور۔قدرت نے ادبی وصف کا بیج روزِ اول سے ڈال دیا تھا آنرز ان اردو ۱۹۴۷ء میں اور بی اے ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔''گنجینہ اردو'' کے نائب مدیر بھی رہے جبکہ مدیر احسان دانش تھے۔پھر اپنے مرشد کے کہنے کے مطابق مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر جیسے کہنہ مشق صحافیوں سے تربیت حاصل کی۔کتب۔ہندوستان کی مٹی (افسانہ) کاربنکل کی تشخیص۔پنجابی میری زبان۔دورِ خسروی۔شہابِ ثاقب۔نویدِ منزل۔آہنگِ حجاز مجموعہ نعت رسول ﷺ ہے۔ثاقب کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ہے اس کی طبیعت میں شرافت، سعادت، شرم حضوری اور دیانت فکر وعمل کی بنیادیں گہری ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں نو جوانی اور جوانی کے دونوں زمانوں میں کبھی بے نفسی بے راہ روی یا فکری آوارگی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔اور وہ ہمیشہ بندھے ٹکے اسلوب زندگی پر کاربند رہے ہیں۔چنانچہ ان کی شاعری کو دیکھیئے فکر میں جدت تو ہے ابتذال نہیں دین اور حمیت دین تو ہے ملائیت نہیں۔عشق تو ہے لیکن فسق کا شائبہ تک نہیں، غریبوں کی مصیبتوں پر آنسو ہیں۔موجودہ نظام عدم مساوات کے خلاف طیش ہے۔لیکن کمیونزم نہیں۔یہی اعتدال کا رستہ اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔خوش گل، خوش گلو، سروقامت، مقطع داڑھی، شیروانی پوش، ثاقب زیروی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔اعلیٰ مشاعروں میں جہاں چیدہ لوگوں کا اجتماع ہو ثاقب زیروی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے تھے۔وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں انتہا پسند نہیں تھے۔وہ ہر اعتبار سے میانہ رو، سلامتی پسند اور غیر حاسد قسم کے آدمی تھے۔ان کی یہی خصوصیت انہیں حلقہ احباب میں مقبول بنائے رکھتی تھی۔ثاقب زیروی کا شاعر ہونا اور اس حد تک دھانسو شاعر ہونا تاریخ ادب کا ایک عجیب وغریب واقع ہے۔عنفوانِ شباب میں ثاقب سب انسپکٹر تھے۔لیکن کون جانتا تھا کہ یہی سب انسپکٹر شاعری کی دنیا میں مقبول خاص وعام ہو جائے گا۔میاں محمد شفیع کہتے ہیں کہ ثاقب زیروی انجمن اسلام کے ایک جلسے میں موجود تھے جب ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی گئی تو اپنے اشعار اور گداز ترنم کے بل پر پورے جلسہ پر چھا گئے اور اس دن سے ثاقب زیروی کے سامنے ایک اعلیٰ ادبی مستقبل اُجاگر ہو گیا۔خلوص اظہار، سوز وگداز اور خیال واسلوب کی ہم آہنگی ثاقب زیروی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔خاص طور پر ان کی نعتیں حضوری قلب کا بہترین اظہار ہوتی ہیں۔اور اس مرحلہ پر اردو کے بہت شعراء ان کی برابری کرتے ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ثاقب زیروی طبیعت اور فکر کے اعتبار سے مذہب پرست ہیں اور وہ نعتیں خانہ پُری کے لئے نہیں لکھتے بلکہ احتیاج طبیعت اور طبعی رجحان کے ماتحت لکھتے ہیں اور یوں ان میں صداقت، خلوص اور جذبہ کار چاؤ بھرپور انداز میں موجزن ہوتا ہے۔

تو حبیبِ ربِ جلیل ہے تیری عظمتوں کا جواب کیا
تو مقامِ فخرِ خلیل ہے تیری حُرمتوں کا حساب کیا

کہاں تو کہ باعث کُن مکاں کہاں فکر ثاقبِ خستہ جاں
بلا مدحتِ شہ اِنس و جاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

اس ایک نعت سے ہی ثاقب زیروی کے وفورِ جذبات اور عشقِ رسول کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ثاقب کے ہاں اسی قدر ونوعیت کی اور بھی کئی نعتیں بھی ملتی ہیں ۔ثاقب زیروی شعروسخن کی عظیم رفعتوں پر فائز تھے اور خصوصاً نعت رسولؐ کے بارے میں اپنے عاشقانہ رنگ، جذبہ فدائیت، جدت استعارات، لطافتِ تخیل، تشبیہ کی خوبی، مضامین کی جامعیت، اور والہانہ اندازِ بیان میں آپ کا کلام اپنی نظیر آپ ہے ۔نعت گوئی کے وصف میں یکتائے روزگار تھے، عشق محمد ﷺ آپ کا سرمایہ حیات تھا۔یہی وجہ ہے کہ شمع حُبِ نبوی ؐ آپ کے دل ودماغ میں پوری آب وتاب سے روشن تھی۔ثاقب زیروی کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے متفرق اور متنوع ہوتی ہیں لیکن اس میدان میں ان کا جذبہ حُب الوطنی کے گرد گھومتا ہے۔صبح دیانت، وطن، یاددہانی اور مجاہد وغیرہ یہ تمام نظمیں ملکی حالات کے متعلق ہیں۔المختصر ثاقب کی شاعری پاکیزہ باسلیقہ اور سلامت رو ہونے کے ساتھ ساتھ غنایت کی بھی حامل ہے۔ ان کی شاعری ایک اعلیٰ کلچرڈ کی طبیعت کی عکاسی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں تاثر کا عنصر بدرجہ کمال پایا جاتا ہے اور ہر سامع ان کے اشعار سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باکمال صاحبِ قلم پر، پُرشکوہ ستاویزی اشاعت شائع کرنا ہر ادارے کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے اور جس کی ۶۰ سالہ قلمی زندگی کی طویل صبر آزما جدوجہد کی داستاں کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔پھر بھی کچھ سرپھرے ادبی مجنوں یا لوح وقلم کی پرورش کی مرض میں مبتلا اپنے خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کررہے ہیں۔بقول شاعرِ مشرق۔ نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

ثاقب زیروی جیسی شخصیت پر لکھنا اس لئے بھی دشوار ہے کہ بقولِ ثاقب صاحب کہ ''ہم جو تھے وہ نہیں رہے جو بننا چاہتے تھے وہ بن نہیں پائے'' ایسی شخصیت جس نے برصغیر کی ریاستوں کے عروج وزوال اور عزت دار گھرانوں کو گردشِ لیل ونہار کے باعث گم نام ہوتے دیکھا ہو۔جس نے خاندانی خون کے الرغم قول وفعل کے تضاد کو دیکھا اور اپنے جذبات کو اشعار میں قلم بند کیا۔ایسے شخص کے متعلق لکھنا اس لئے مشکل ہے کہ جس نے اپنی سیاسی بصیرت کو ہمیشہ فطرتی وکائناتی حقائق کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ جس نے اعتدال کے ساتھ ساتھ محبت و بھائی چارے کے وسیع کینوس پر اپنے نقشِ محبت کو اپنے عمل سے ثبت کیا۔ جسے قدرت نے وصف عطا کیا کہ ''کسی کی تحریر کے چند فقرے اور گفتگو کے چند مکالمے اس کے معیارِ وفا کے نقش بن کر ثاقب صاحب کے ذہن میں اُجاگر ہو جاتے تھے اور اس نقش کے مطابق ثاقب صاحب نے جس سے جو بھی تعلق قائم کیا اس کو ہمیشہ اس پر نازرہا'' یہ محض ان کے خالق ومالک کا فضل تھا جس نے الفاظ کی پہچان اور ان کے اوزان کی صلاحیت انہیں ودیعت کی۔اسی کے فیض نے ہمیں ایک اچھا مصنف، اچھا شاعر وادیب عطا کیا اس کے علاوہ ایک انسان دوست دیا جو بے غرض اطاعت اور بے پایاں محبت کا مجسمہ شاہکار ثاقب زیروی کی شکل میں دیا۔جس نے ہمیشہ اپنی تحریر لکھتے وقت ان باتوں کو مدنظر رکھا کہ ''اس فقرے کے ملکی حدود میں کیا معنی کئے جاسکتے ہیں اور ملکی حدود سے باہر کیا؟ میرے دین کے لئے کیا مفہوم رکھتا ہے اور بعد میں میری قوم پر کیا اثر چھوڑے گا ایسی مستند تحریر لکھنے والی شخصیت پر لکھنا کچھ آسان نہیں''۔

بانی ہفت روزہ ''لاہور'' ثاقب زیروی نے اردو صحافت کی اعلیٰ روایات کو جس طرح زندہ تابندہ رکھا۔وہ اپنی جگہ مسلم لیکن وفا اور وضع داری کے اس پیکر کی ساری زندگی تامرگ، ہرلمحہ ایک ہی لگن اور ایک ہی مشن پر قائم رہی ''اعلیٰ دینی اقدار کا قیام واستحصالی نظام کا خاتمہ رہی۔

ثاقب زیروی صاحب سولو صحافت کا نادر نمونہ تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی صحافت کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو کوئی مورخ آپ کے نام کا ذکر کئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے گا۔تنِ تنہا پچاس سال تک ہفت روزہ ''لاہور'' سورج کی سی باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ثاقب زیروی نہ جانے کیا شے تھے۔ وہ مقدمات بھی بھگتتے رہے مبارک بادیں بھی سمیٹتے رہے گالیاں بھی سنتے رہے، دعائیں بھی لیتے رہے، وہ مشاعروں کی جان تھے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں شائقین کی آنکھوں کے تارے تھے۔ اور دلوں کی دھڑکن، وہ جہاں صاحبانِ اقتدار کا دوست تھے اسی طرح غریبوں کا مونس و غمخوار بھی۔وہ کبھی بڑے بڑے شاعروں کی موجودگی میں مشاعروں کو الٹ دیا کرتے تھے اور کبھی پٹے ہوئے مشاعروں کو جمادیا کرتے تھے۔ان کی زندگی میں کئی نشیب وفراز بھی آئے مگر وہ ویسے کے ویسے ہی رہے۔اُن کی باتوں سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا وہ تہہ بہ تہہ کھلتے تھے مگر کم کم احباب

پراور جن پر کھلتے تھے اُن کو اپنی محبتوں اور شفقتوں میں سمیٹ لیا کرتے تھے اور وہ اُن محبتوں شفقتوں کا محور دیکھتا رہ جاتا کہ ایسا کس وجہ سے اور کیوں؟

آپ کے ہم عصروں میں فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، بابا کمل پوش، کلیم عثمانی، طفیل ہوشیار پوری، مولانا صلاح الدین، حکیم سعید، احسان دانش، ساغر صدیقی، سیف الدین سیف، مصطفیٰ زیدی، عدم، تاثیر، تبسم اسد ملتانی، کوثر نیازی، ،مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، تلوک چند محروم، رام لعل، مولانا تاجور نجیب آبادی، جگر مراد آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، سردار دیوان سنگھ مفتون، م۔ش۔ مجید نظامی، ن۔م راشد، نذیر شیخ، دوست جالندھری، مجید لاہوری، مولانا ظفر علی خان، سردار راجندر سنگھ بیدی، تھے۔ جن کا گاہے گاہے ذکرِ خیر چلتا رہتا تھا۔ ثاقب زیروی صاحب کی شخصیت اگر چہ نمایاں طور پر تبلیغ دین، شاعری، صحافت اور ادارت پر مشتمل تھی۔ اس کے آگے دو پہلو تخصیص کے حامل یہ تھے کہ انہوں نے مشکلات کے باوجود اپنا مشنری ذوق ابلاغ عمر بھر جاری رکھا اور صحافت میں انہوں نے اردو صحافت کا سب سے مشکل پہلو ''یک رکنی'' صحافت کا اختیار کیا تھا۔ دنیا کی کسی زبان میں بھی ایسی صحافت مشکل ترین ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح کی صحافت اردو میں اس لئے خاص اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ مدیر کو باوصف نظریاتی اخلاص کے زندگی کے سبھی پہلوؤں پر یکساں گہرائی کی نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کے لئے مشاہدے اور مطالعے کا ہمہ وقت مجاہد بننا لازم ٹھہرتا ہے اس روایت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' مولانا محمد علی کا ''ہمدرد'' مولانا حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' اتنی بڑی مثالیں ہیں کہ بعض دفعہ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ ثاقب زیروی صاحب نے ۱۹۵۲ء جیسے نامساعد حالات میں اپنے لئے اسقدر مشکل راستہ کیوں اختیار کیا۔ لیکن ''لاہور'' کے پچاس سال گواہی کے لئے موجود ہیں کہ انہوں نے نہ صرف انتخابِ درس کیا تھا بلکہ پورے تقاضوں اور شان بان کے ساتھ اسکو پورا رکھا اور جو سابق رواج خلوصِ کار اور ذاتی پاکیزگی کا تھا اسے تابانی سے جاری رکھا۔ ایسے دقیق مگر اوصافِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ ثاقب صاحب سے ملنے والے تمام لوگ یہ بھی گواہی دیں گے کہ وہ شرح محمدؐ یہ پر پورے طور پر تمام عمر کاربند رہے۔ اور ساری عمر ایک سالک صوفی اور باعمل عالم کے طور پر گزاری۔ ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں گل وبلبل، لب ورخسار، ہجر ووصال، شمع و پروانہ کا رونا نہیں رویا بلکہ انسان پر انسان کے ظلم کی داستان بھی بیان کی ہے۔ انسان کی چیرہ دستیاں اور انسان کی مجبوریوں پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں حسن وعشق کے ساتھ ساتھ غربت کے چھپے ہوئے ناسوروں کو بھی ننگا کیا ہے۔ مذہب کے مقدس نام پر خوں ریزی کرنے والے جعلی مولویوں کو وطن دشمنوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ ثاقب زیروی ایک درویش صفت شاعر ہیں۔ اُن کے ساتھ ادیب، پاکستان بننے سے قبل وہ تحریک پاکستان کے صفِ اول کے مجاہد تھے اور پاکستان کے لئے انہوں نے شب وروز کام کیا۔ اور ان کے بہت سے عزیز تقسیم کے وقت شہید ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں لاہور کی صحافت پر ایک ایک نئے روشن ستارے کی طرح طلوع ہوئے اور آدھی صدی تک لوگوں کے دلوں میں اپنی نثر، اور شاعری سے جگمگاتے رہے۔ آخر شہابِ ثاقب بن کر ٹوٹے، فضا میں روشنی بکھیرتے ہوئے اپنی حسیں یادیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اُن کے قلم میں جادو تھا۔ دوست نواز، عظیم شاعر، باکمال صحافی، ہنس مکھ ساتھی، غمگسار رفیق، بہترین استاد و دوست تھے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہ مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر ویرانے پہ کیا گزری

---

## پروفیسر عبدالقدیر کوکب لندن

غم زدہ دل تجھے ہوا کیا ہے
ترے اس غم کی اب دوا کیا ہے
دل تو روتا رہے ہے روز و شب
ترے رونے کا مدعا کیا ہے
جو ہے بویا وہی تو کاٹے گا
سوچ لے خود ہی بو رکھا کیا ہے
روز کر غور نیند سے پہلے
دن کو کھو کر تو پا چکا کیا ہے
میں تو جاں تک نثار اس پہ کروں
کچھ بتائے وہ چاہتا کیا ہے
ہجر میں صبر آگیا کوکب
چارہ اس کے مگر سوا کیا ہے

## ایک تعارف

# فرحت عباس شاہ

فرحت عباس شاہ کا شمار دنیا کے ممتاز اور اہم شعرا میں ہوتا ہے۔انہوں نے اردو اور پنجابی میں بہت کلام تخلیق کیا۔موضوعات کی وسعت اور کیفیات کے اظہار میں ایسی تخلیقی قوت کسی اور شاعر میں نظر نہیں آتی۔فرحت عباس شاہ نے نہ صرف معاشی بے انصافی پر قلم اٹھایا بلکہ دنیا کا پہلا اسلامک مائیکرو فنانس ماڈل بنا کی اس کو عملی طور پر ثابت بھی کیا۔فرحت عباس شاہ نے ٹرکل ڈاون اکنامک تھیوری کو رد کر کے ٹوئیسٹ اپ اکانومی تھوری پیش کی اور ہزاروں خاندانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا۔فرحت عباس شاہ نے فلسفہ، نفسیات، موسیقی، ادب، صحافت اور مارشل آرٹ جیسے شعبوں میں اپنی حیثیت نہ صرف منوائی بلکہ قبول عام کی سند حاصل کی۔انہوں نے ہمیشہ، عالمی امن، محبت اور انسانیت کے نظریات کی سربلندی کو فوقیت دی۔

**فرحت عباس شاہ:** پیدائش۔15 نومبر 1964ء جھنگ، پنجاب، پاکستان۔پیشہ۔صحافی، شاعر، ادیب، نقاد، سی ای او لاہور ٹی وی، ڈائریکٹر، ٹی وی اینکر۔قومیت۔پاکستانی۔مادر علمی۔گورنمنٹ کالج جھنگ (1981ء تا 1986ء) جامعہ پنجاب (1986ء)، پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف مینجمینٹ (2008ء)، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ۔سائنسز (2008ء)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (2009ء)

اصناف: محبت، رومان۔موضوع: ادب، صحافت، سوشلزم، تنقید نفسیات پیدائش اور ابتدائی تعلیم۔فرحت عباس شاہ بروز اتوار 10 رجب 1384ھ مطابق 15 نومبر 1964ء کو جھنگ شہر پنجاب، پاکستان میں پیدا ہوئے۔فرحت عباس شاہ نے ابتدائی تعلیم جھنگ میں ہی حاصل کی۔جھنگ میں ہی ایم ایس سی نفسیات کی ڈگری حاصل کی۔مزید اعلیٰ تعلیم کے واسطے لاہور چلے آئے۔1988ء تا 1990ء تک وہ جامعہ پنجاب میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔1990ء میں جامعہ پنجاب، لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

**بحیثیت مارشل آرٹسٹ::** فرحت عباس شاہ قومی سطح پر تسلیم کیے جانے والے مارشل آرٹسٹ ہیں۔برما کے مشہور برمیز مارشل آرٹس میں گرینڈ ماسٹر اشرف طائی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔1990ء میں قومی میلہ مویشیاں لاہور میں فرحت عباس شاہ نے عالمی تاریخ میں پہلی بار برف کے 11 بلاک توڑنے کا ریکارڈ قائم کیا۔آج تک یہ عالمی ریکارڈ قائم ہے۔تا حال 4 لاکھ سے زائد شاگرد اُن سے مارشل آرٹ کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔فرحت عباس شاہ نے مارشل آرٹ کی تکنیک کو کھیلوں میں متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور باقاعدہ اِس کو ضابطہ اختیاری اصول وقواعد کے تحت متعارف کروایا۔وہ بحیثیت مارشل آرٹسٹ کے پاکستانی نِنجا کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔

**امن وآشتی کے علمبردار:** فرحت عباس شاہ نے عالمی طور پر مارشل آرٹ کی تعلیم میں بردباری، امن وسکون، خود اعتمادی اور امدادی افکار جیسی بنیادی قواعدی اصولیات کو متعارف کروایا ہے جس کی وجہ سے وہ مارشل آرٹ میں امن وآشتی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔

**بحیثیت شاعر وادیب:** فرحت عباس شاہ نے 13 سال کی عمر میں نظمیں لکھنا شروع کیں جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئیں۔باقاعدہ شعری مجموعہ شام کے بعد ماہِ جون 1989ء میں منظر عام پر آیا جس سے اُن کی شہرت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا، تا حال اِس شعری مجموعہ کے 20 سالوں میں 100 سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔یہ کتاب رومانوی اور محبت پر مشتمل نظموں کا مجموعہ ہے۔تقریباً 20 سالوں میں فرحت عباس شاہ کے قلم سے 67 کتب منظر عام پر آئیں جن میں 46 کتب صرف شاعری پر ہیں اور 3 کتب بحیثیت نقاد شائع ہوئیں۔40 سال کی عمر تک اُن کے 46 شعری مجموعہ جات شائع ہو چکے تھے۔اکیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں وہ رومانوی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جنگ مخالف شاعر بھی خیال کئے جانے لگے۔2001ء میں امریکا کے افغانستان پر حملہ سے وہ کافی متاثر ہوئے اور اُن کے شعری خیالات میں کافی حد تک تبدیلی دکھائی دی۔سانحہ 11 ستمبر 2001ء کے بعد جاری ہونے والی امریکی-افغان جنگ (2001ء 2014ء) میں فرحت عباس شاہ کی نظموں میں مختلف تبدیلی نظر آئی، وہ امریکی-افغان جنگ (2001ء 2014ء) کے مخالف ہونے کے سبب سے مخالفانہ نظمیں اختصار تحریر کرتے رہے۔اِس سلسلہ میں اُن کا شعری مجموعہ ہم اکیلے ہیں بہت شائع ہوا۔تا حال اُن کی ایک تصنیف کا پنجابی ترجمہ اور 4 کتب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔انگریزی تراجم یہ ہیں۔

Love, Sarabi, America My Friend After Evening,Critical work on Farhat Abbas Shah,

# دنیائے افسانچہ کے بانی جناب پرویز بلگرامی کی جانب سے افطار پارٹی اور ادبی نشست کا اہتمام

رپورٹ و تصاویر
محسن نقی

17 اپریل کو دنیائے افسانچہ کے بانی و چیئرمین اور معروف افسانہ نگار جناب پرویز بلگرامی نے سنگت یاری کیفے ،کراچی میں جرمنی سے آئے ہوئے مہمان شاعر،افسانہ نگار،ناول نگار،تنقید نگار اور مصور جناب سرور غزالی کے اعزاز میں افطار پارٹی اور ادبی نشست کا اہتمام کیا اس تقریب میں جناب سرور غزالی کی شخصیت،انکی ادبی خدمات اور افسانچہ نگاری پر علمی شخصیات نے اظہار خیال کیا،اور مصنفین جن میں جناب اقبال خورشید،جناب پرویز بلگرامی،جناب ڈاکٹر اقبال ہاشمانی اور جناب نثار نندوانی نے اپنے اپنے افسانچے سنائے جنہیں حاضرین نے بہت زیادہ پسند کیا اور سب کو بھرپور داد و تحسین سے نوازا،مہمان شاعر،افسانہ نگار،جناب سرور غزالی نے بھی اپنا افسانچہ اور اپنا شعری کلام سنایا جسے حاضرین نے بہت زیادہ پسند کیا،تقریب کی نظامت کے بخوبی فرائض جناب پرویز بلگرامی نے انجام دیئے،تقریب کے آغاز میں جناب غلام رحیم بلیدی نے تلاوت اور نعت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی،اس تقریب میں جناب سرور غزالی سے بات چیت ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ وہ بی ایس سی کراچی،ایم ای برلن، ایم اے اردو جرمن ترجمان،شعبہ سائینسیز،کارلس روئے،جرمنی،چاوران کا وہاں جرمنی میں پیشہ مترجم اردو جرمن ہے اسکے علاوہ تدریس:مدرس لسانیات اردو،ہمبولڈ یونیورسٹی جرمنی،اور معتمد خاص بزم ادب برلن،اور سابق مدیر کاوش آن لائن ہیں،جناب سرور غزالی کے اب تک تین افسانوی مجموعے،" بکھرے پتے"،" بھیگے پل" اور" سورج کا اغوا" منظر عام پر آ کر کامیابی حاصل کر چکے ہیں اسکے علاوہ ان کے دو ناول" دوسری ہجرت"،" شب ہجراں" نے بھی بھرپور کامیابی حاصل کی ہے،اسکے علاوہ" خوف میں گھرا انسان" سندھی زبان میں افسانوں کا ترجمہ ہے،تقریب کے آغاز میں معروف دانشور جناب مجید رحمانی نے خطاب کرتے ہوئے سب سے پہلے دنیائے افسانچہ کے بانی و چیئرمین جناب پرویز بلگرامی کا جناب سرور غزالی کے اعزاز میں افطار پارٹی اور ادبی نشست منعقد کرنے پر بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا مزید ان کا کہنا تھا کہ افسانہ ادب کی نثری صنف ہے لغت کے اعتبار سے افسانہ جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں یہ لوک کہانی کی ہی ایک قسم ہے،ناول زندگی کا کل اور افسانہ زندگی کا جز پیش کرتا ہے جبکہ ناول اور افسانے میں طوالت کا فرق بھی ہے اور وحدت تاثر کا بھی اسی طرح انسانی تجربے کو نثری صورت میں کم سے کم لفظوں میں بیان کرنا افسانچہ کہلاتا ہے،مہمان شاعر،افسانہ نگار،جناب سرور غزالی کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ سرور غزالی کا کمال یہ ہے کہ ایک ساتھ شاعر،فکشن نگار،اور مصور ہیں،اور اس فن کے ماہرین کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سماجی و معاشرتی سچائی کی عکاسی اپنے فن کے ذریعے پیش کرنے میں دیگر افراد سے زیادہ حساس ہوتے ہیں،معروف افسانہ نگار محترمہ نشاط یاسمین خان نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب سرور غزالی کے تمام افسانوں میں ایک چیز مشترک ہے یعنی تمام افسانے حقیقت کے عکاس ہیں چونکہ ناول کے بعد افسانوی ادب کا فروغ وقت کی قلت پیش نظر ہوا اس لئے سرور غزالی نے افسانوی غرض و غایت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے تخلیقی جوہر کو بروئے کار لائے اور بہترین نمونہ پیش کیا ان کے تمام افسانے اس قدر مختصر ہیں کہ افسانچوں کا گماں ہوتا ہے۔

معروف افسانہ نگار محترمہ صائمہ نفیس نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ افسانچے میں لفظوں،سطروں،صفحوں کی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی اصل بات کہانی پن،اختصار،تحیر،، تجسس کا ہونا،جس سے کوئی واقعہ یا لمحہ قید ہو کر کہانی کی شکل اختیار کرے۔ناول ہو،افسانہ یا افسانچہ اسی وقت کامیاب ہیں جب اس میں قصہ پن موجود ہو۔محترمہ صائمہ نفیس نے

دنیائے افسانچہ کے بانی و چیئرمین جناب پرویز بلگرامی کو جرمنی سے آئے ہوئے مہمان شاعر، افسانہ نگار کے اعزاز میں اعلیٰ تقریب منعقد کرنے پر بہت بہت مبارک باد پیش کی اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا، معروف افسانہ نگار جناب عبدالغفور کھتری نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کی شاندار اور یادگار تقریب میں تمام مصنفین نے اپنے اعلیٰ افسانچے سنا کر تقریب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مزید ان کا کہنا تھا کہ افسانچے کے لیئے چار نکتے کو لازم مانا جاتا ہے، پہلا واقعہ، دوسرا اختصار، تیسرا الفاظ کی مضبوط بندش، اور چوتھا چونکا دینے والا اختتامیہ افسانچے میں موضوع کا انتخاب بھی اہم ہوتا ہے، موضوع آدھی کہانیوں سے روشناس کراتا ہے اس فنی نکات کی روشنی میں سرور غزالی کا مجموعہ" بھیگے پل" اپنی فنی اور اصولی خصوصیات کی وجہ سے افسانچے کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتا ہے، ان کے بعد جرمنی سے آئے ہوئے مہمان شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار، مصور، جناب سرور غزالی نے خطاب کرتے ہوئے دنیائے افسانچہ کے بانی و چیئرمین جناب پرویز بلگرامی کا ان کے اعزاز میں افطار پارٹی اور ادبی نشست منعقد کرنے پر بہت بہت شکریہ ادا کیا ساتھ ساتھ انہوں نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا بھی تقریب میں بھرپور شرکت کرنے پر بہت بہت شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ آج مجھے آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے اور میں آپکی یہ محبتوں بھری ملاقات ہمیشہ یاد رکھوں گا اور انشاء اللہ جلد اپنے پیارے وطن پاکستان میں آؤں گا اور ہم سب پھر ایسے ہی دوبارہ مل بیٹھیں گے، اس موقع پر جناب سرور غزالی کو دنیائے افسانچہ کی جانب سے " لوح تشکر" یادگاری شیلڈ پیش کی گئی اور دیگر علمی و سماجی شخصیات نے جناب سرور غزالی کو گلدستے، اجرک، کتب اور دیگر تحائف پیش کیئے، تقریب کے اختتام پر دنیائے افسانچہ کے بانی و چیئرمین جناب پرویز بلگرامی نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا تقریب میں بھرپور شرکت کرنے پر بہت بہت شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اب روزہ کھلنے والا ہے مغرب کی ازان کے ساتھ آپ سب روزہ افطار کریں اور مغرب کی نماز کے بعد عشائیہ کی دعوت بھی قبول فرمائیں، آج کی تقریب میں جن علمی و سماجی شخصیات نے شرکت کی ان میں جناب رحمان نشاط، علی رازشر، جاوید احمد جگ، طلعت قریشی، شاہد احمد خان، مجیب اوٹھو، غلام رحیم بلیدی، اقبال خورشید، مجید رحمانی، ڈاکٹر اقبال ہاشمانی، نثار نندوانی، عبدالغفور کھتری، محترمہ نشاط یاسمین خان، محترمہ صائمہ نفیس، اور خاکسار محسن نقی شامل تھے اور اب تقریب کی رپورٹنگ کے دوران لی گئیں تصاویر پیش خدمت ہیں امید ہے آپ کو پسند آئیں گی آپکی رائے کا منتظر رہوں گا۔

***

# ٹاپ ٹرینڈز کی سیاست

(بشکریہ:92 نیوز مورخہ 19 اپریل 2022ء)

عوامی ایشوز اور کارکردگی اب قصہ پارینہ ہوئے۔ اب 'ٹاپ ٹرینڈز' کی سیاست کا دور ہے۔ جھوٹ بولیے، Trolls اور Bots کے ذریعے اس جھوٹ کو پھیلا دیجیے، میدان آپ کا ہوا، آپ سرخرو ہوئے۔ اس طریقہ واردات کو، اس کی سنگینی کو اور سماج کی نفسیاتی تشکیل پر اس کے اثرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بعض اہل سیاست اگر مین سٹریم میڈیا کی بجائے سوشل میڈیا کی جانب میلان رکھتے ہیں، تو اس کی وجہ محض ابلاغ نہیں۔ اس کی وجہ یہ حقیقت بھی ہے کہ میڈیا میں زیادہ سے زیادہ آپ کو Trolls تو مل سکتے ہیں، Bots نہیں۔ جب کہ سوشل میڈیا پر آپ کو دونوں دستیاب ہیں۔ اب جس کے پاس سوشل میڈیا میں جتنی مہارت ہے، جھوٹ پر اس کے جملہ حقوق اتنے ہی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ Trolls اور Bots کیا ہوتے ہیں؟ سادہ سے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ Troll وہ ورکر، کارکن یا کارندہ ہوتا ہے جو سوشل میڈیا پر کسی خاص موقف کو پھیلا رہا ہوتا ہے اور Bots ایک غیر حقیقی کارندے کا کردار ادا کرتے ہیں اور یہ ایک مصنوعی اکاؤنٹ ہوتا ہے۔ پیسے، سرپرستی اور فرصت ہو تو حسب استطاعت پچاس ہزار سے پچاس لاکھ bots لیپ ٹاپ میں رکھ لیجیے، پروپیگنڈا کرنے اور ٹاپ ٹرینڈ بنانے میں کام آئیں گے اور Trolls کے دست و بازو بنیں گے۔ ایک کلک کیجیے اور لاکھوں Bots اودھم مچانے کو میدان میں ہوں گے۔ یہ Trolls اور Bots جب مل جاتے ہیں تو ایک پروپیگنڈا فورس تیار ہو جاتی ہے۔ راتوں رات ایک جھوٹ تراشا جاتا ہے اور صبح تک وہ جھوٹ حقیقت بن کر ٹویٹر سے وٹس ایپ تک 'ککڑوں کوں' کر رہا ہوتا ہے۔ جب تک معلوم ہوتا ہے یہ تو جھوٹ تھا، مقصد حاصل کیا جا چکا ہوتا ہے۔ اب کون کس کس کو بتاتا پھرے کہ بھیا یہ جو تم رجز پڑھ رہے ہو یہ تو سارا جھوٹ ہے؟ آج کل محترمہ جسٹس ناصرہ اقبال صاحبہ کا ایک مضمون وائرل ہوا ہے۔ اس مضمون میں وہ بتا رہی ہیں کہ عمران خان صاحب کے خلاف امریکہ نے کیسے کیسے سازش کی اور کن وجوہات کی بنیاد پر کی۔ درجن بھر لوگ یہ مضمون مجھے بھیج چکے ہیں۔ اب کل سے یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ جسٹس صاحبہ نے اس کی تردید کر دی ہے اور ان کا کہنا ہے یہ انہوں نے نہیں لکھا۔ مضمون مگر لاکھوں تک پہنچ چکا ہے، اس کی

تردید شاید ہزاروں تک بھی نہ پہنچے۔انگریزی میں لکھا یہ مضمون اردو ترجمے کے ساتھ بھی دستیاب ہے۔یہ اہتمام بتا رہا ہے کہ پروپیگنڈے ایسے نہیں ہو جاتے ،اس کے لیے بڑی محنتیں کرنا پڑتی ہیں۔الیکشن کے وقت عمران خان صاحب نے ایک ایسے آدمی کو پارٹی میں شامل کیا جس کے دامن پر اداکارہ شبنم کے اغواء سمیت سنگین جرائم کا دھبہ تھا۔

اس پر شور مچ گیا۔دباؤ بڑھا اور یہ فیصلہ انہیں واپس لینا پڑا۔اس ''ڈیمیج کنٹرول'' کے لیے راتوں رات بنگلہ دیش سے اداکارہ شبنم کا ٹویٹ سامنے آ گیا جس میں وہ عمران خان صاحب کے اس ایمان افروز اقدام کی تعریف کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔دو دنوں میں معلوم ہو گیا کہ یہ ٹویٹ جعلی ہے۔لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔لوگ اب تک حوالے دیتے ہیں کہ شبنم جی بھی خان صاحب کی ممنون ہیں۔عمران خان صاحب کشمیر کے سفیر بنے اور ایک دن پورا آدھا گھنٹہ کھڑے رہے تو سید علی گیلانی صاحب مرحوم کا ٹویٹ سامنے آ گیا،جس میں عمران خان کے اقدامات کو قابل تعریف کہا گیا۔میں نے سید علی گیلانی کے ترجمان سے رابطہ کیا تو جواب ملا:''ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ سید علی گیلانی کا کوئی ٹوئٹر اکاؤنٹ نہیں ہے،وہ سوشل میڈیا پر موجود ہی نہیں ہیں۔'' پشاور میں جلسہ ہوا۔ہمارے مذہبی رجحان رکھنے والے دوست علی محمد خان نے ناسا کی آٹھ سالہ پرانی تصویر اٹھا کر ٹویٹ کر دی کہ یہ لیجیے پورا شہر عمران کے لیے نکل آیا۔اور تصویر بھی کہاں کی؟ جزیرہ نما آئبیریا کی۔اطراف میں سمندر کی تاریکی ہے اور بیچ میں سپین اور پرتگال جگمگا رہے ہیں۔غلط بیانی پکڑی گئی مگر ازراہِ مروّت بھی کوئی شرمندہ نہیں ہو رہا۔مطلوب و مقصود جب ماحول بنانا ہو تو پھر جھجک کیسی۔اسی جلسے کی ایک تصویر جناب اسد قیصر اور پرویز خٹک صاحب کے ٹوئٹر پر شیئر کی گئی۔پرویز خٹک صاحب نے لکھا یہ آزادی کی تحریک ہے اور اسد قیصر نے لکھا یہ انقلاب ہے انقلاب۔دل چسپ بات یہ ہے کہ دونوں نے جو تصویر لگائی وہ جے یو آئی کے 2017 کے صد سالہ عالمی اجتماع کی تھی۔یہ تصویر جمعیت علمائے اسلام کے آفیشل فیس بک اکاؤنٹ پر 8 اپریل 2017 کو شیئر کی گئی،وہاں موجود ہے اور دیکھی جا سکتی ہے۔اب اگر قیادت کا طرزِ عمل یہ ہے تو تصور کیجیے بات جب نیچے Trolls اور Bots تک پہنچتی ہو گی تو کیا ہوتا ہو گا؟ اہتمام سے کچھ ویڈیوز بنائی جاتی ہیں اور پھر انہیں ٹرینڈ بنا دیا جاتا ہے۔ابھی حال ہی میں ایک غریب خاتون آلو ٹماٹر خریدتے ہوئے عمران خان کی غریب پروری کی تعریف کر رہی تھی۔اس ویڈیو کو جناب شہباز گل نے شیئر کیا کہ ''یہ ہے اس قوم کی بیٹی،کاش ہمارے بڑے بڑے دانشور اپنے بغض سے نکل کر یہ دیکھ سکیں''۔دیکھنے والے بھی مگر قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔لوگوں نے ڈھونڈ نکالا کہ چند ماہ پہلے اسی خاتون کی ویڈیو برطانیہ کی اوورسیز کے حوالے سے شیئر ہوئی تھی،آج یہی خاتون مقامی غریب بن کر سبزی منڈی سے ویڈیو شوٹ کروا رہی ہے۔ایک صاحب نے لکھا کہ ''عورت نہیں بدلنی تھی تو اینکر ہی بدل لیتے''۔سب سے اچھی گرہ جبران ناصر نے لگائی کہ ''فزہ (اوورسیز) اور شزہ (مقامی) دونوں تحریک انصاف کی مداح ہیں۔ایسا نہیں کہ دیگر جماعتیں حق کی علم بردار ہیں۔ن لیگ کے پاس بھی مفتاح اسماعیل جیسے نابغے موجود ہیں جو مہینہ پہلے دہائی دیتے تھے کہ عمران نے پٹرول مہنگا کیوں کر دیا اور اب سر پیٹ رہے ہیں کہ عمران سستا پٹرول کیوں دیتا رہا۔البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کا طریق واردات تھوڑا دیسی اور قدیم ہے جب کہ تحریک انصاف نے اسے ڈیجیٹلائز کر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔اب زمین پر کسی کارکردگی کی ضرورت نہیں۔تھوڑا سا پوسٹ ٹروتھ ، جذباتی قسم کی چند ویڈیو، چارپائی پر لیٹا کوئی معذور جو معذوری کے باوجود جلسے میں آیا ہو، ہولے ہولے سے میوزک کی آنچ ،ذرا سی جذباتیت، دو چار نعرے، سرخرو ہونے کو یہ لوازمات کافی ہیں۔باقی کا کام Trolls اور Bots سنبھال لیں گے۔محسوس یہ ہو رہا ہے کہ آنے والے دنوں میں معرکہ یہیں ہو گا اور میدان اسی کے نام رہے گا۔جو جھوٹ بولنے اور ٹاپ ٹرینڈ تک لے جانے میں مہارت رکھتا ہو۔سوال یہ ہے کہ جب سب اس میدان میں اتریں گے تو اس سماج کا کیا حشر ہو جائے گا؟۔ابھی سے سوچ لیجیے کہ ہمارے لیے کہیں کوئی جائے امان ہو گی یا نہیں؟

***

# جستہ جستہ

عطاء القادر طاہر

یہ ایک لاکھ ہے باقی ویزہ لگنے کے بعد.تھانیدار کے دفتر میں وہ اکیلا ہی تھا۔ بوڑھا کسان اندر داخل ہوا،اس نے اپنے کُرتے کے کھیسے سے خاکی لفافہ نکال کے میز پر رکھتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا:صاحب جی اب تو میرے پوتے کو چھوڑ دیں۔تھانیدار نے جلدی سے وہ لفافہ میز سے اُٹھا کر اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔پھر ٹیڑھی نظروں سے بوڑھے کسان کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:پورے ہیں نا..... بوڑھے کسان نے گردن ہاں میں ہلاتے ہوئے التجائیہ نظروں سے تھانیدار کی طرف دیکھا تو تھانیدار روکھے لہجے میں کہنے لگا شام تک تیرا پوتا گھر پہنچ جائے گا اس کے بعد تھانیدار نے کسان کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

کسان وہاں سے چلا گیا۔تھانیدار سرکاری گاڑی میں بیٹھ کر ضلع کچہری گیا،وہاں جاتے ہی اس نے وہ لفافہ ہائی کورٹ کے وکیل کو دے دیا، جو اپنی لشکارے مارتی گاڑی میں بیٹھا ہوا پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔جناب اب میرے سالے کے اس کیس کو ختم بھی کروا دیں۔تھانیدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔تھانیدار صاحب! آپ کے سالے نے ایک بیوہ کی کروڑوں کی زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے وکیل صاحب نے یہ بتانے کے بعد وہ لفافہ اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھا۔تھانیدار نے صرف فاتحانہ مسکراہٹ پر اکتفا کیا اور وکیل صاحب کی گاڑی سے اُتر گیا۔لاہور کی طرف روانہ ہونے سے پہلے وکیل صاحب نے موبائل پر کسی کو ایک میسج کیا۔جیسے ہی وکیل صاحب ٹھوکر نیاز بیگ لاہور پہنچے انہوں نے باب لاہور کے نیچے سے گزرنے کے بعد نیب دفتر کے عین سامنے سڑک کنارے اپنی گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اردگرد دیکھنا شروع کر دیا۔ایک منٹ کے اندر اندر ان کے پہلو میں ایک مشہور ٹی وی چینل کا کرائم رپورٹر آ کر بیٹھ گیا۔وکیل صاحب نے اسے دیکھتے ہی اپنا کالا چشمہ اُتارتے ہوئے ڈیش بورڈ کی طرف نظروں ہی سے اشارہ کر دیا۔کرائم رپورٹر نے ڈیش بورڈ سے وہ خاکی لفافہ نکالتے ہوئے پوچھا: کتنے ہیں....؟ ایک کاپی وکیل صاحب نے بتایا۔رپورٹر نے شکوے سے بھرپور نگاہ ان پر ڈالی۔ایک قتل ہی تو ہوا ہے میرے بیٹے سے.....ہاتھ ہولا رکھا کرو اور بھی مل جائیں گے۔وکیل کی بات سنتے ہی کرائم رپورٹر دروازے کو زور سے مارتے ہوئے گاڑی سے اُتر گیا۔کرائم رپورٹر نے وہ لفافہ اپنی جیکٹ کی پاکٹ میں ڈالا اور ہسپتال کی راہ پکڑی۔سرنارمل ڈلیوری ہو سکتی ہے۔نرس ابھی ڈاکٹر کو یہ بتا ہی رہی تھی،کہ کرائم رپورٹر ڈاکٹر کے آفس میں داخل ہوا۔ڈاکٹر نے نرس کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔نرس کے جاتے ہی کرائم رپورٹر نے وہ لفافہ اپنی جیکٹ کی جیب سے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا:۔۔ڈاکٹر صاحب یہ ایک لاکھ ہیں،آپریشن کے دوران میری بیوی اور بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ڈاکٹر صاحب نے وہ لفافہ اپنی میز کی دراز میں رکھا اسے لاک لگا کر چابی اپنے سفید کوٹ کی پاکٹ میں ڈالی اور آپریشن تھیٹر کی طرف چل دیئے۔کامیاب آپریشن کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے آفس کو لوٹے اور آتے ہی ٹریول ایجنٹ کو کال ملا دی:ہاں بھئی،میرے ہسپتال سے آ کر پیسے اور پاسپورٹ لے جاؤ ڈاکٹر صاحب دوسرا آپریشن کر کے لوٹے تو ٹریول ایجنٹ ان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے دراز سے وہ لفافہ نکال کر اسے دیتے ہوئے بتایا: یہ ایک لاکھ ہے باقی پیسے ویزہ لگنے کے بعد..... ٹریول ایجنٹ نے وہ لفافہ اپنی شلوار کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ڈاکٹر صاحب آپ ہر سال عمرہ کرنے جاتے ہیں ایمان والے تو آپ جیسے ہی ہوتے ہیں۔

TRANSLATIONS
ENGLISH - URDU
ATA TAHIR
DPSI ENGLISH LAW
IOLET DIPLOMA IN PUBLIC SERVICE
Interpreting Urdu-English Law
07818210181
atatahir@hotmail.com

HEATING LTD.
24/7
EMERGENCY SERVICE
Domestic & Commercial
Contact: 07722 222 965
www.247breakdownsolution.co.uk

# پتنگ کی ڈور (افسانچہ)

امجد مرزا امجدؔ

اب تو اس کی عادت سی بن گئی تھی وہ رات بھر کسی دوست کے ہاں گزارتا۔ دوسرے دن وہیں سے کام پر چلا جاتا۔ چھٹی والے روز بھی دو دن تک غائب رہتا۔ ماں باپ دونوں ایک دوسرے کو چھلکتی آنکھوں سے دیکھتے اور کچھ سوچ کر چپ کر جاتے مگر اسے کچھ نہ کہہ پاتے۔

اللہ جانے کیسے دوست ہیں جن کے پاس وہ راتیں گزارتا ہے۔ آئے دن اخبارات میں ڈرگز اور نوجوانوں کی بے راہ روی کے واقعات پڑھ کر وہ ہاتھ اٹھا کر روتے ہوئے اس کی سلامتی کی دعائیں کرتے۔ ایک بیٹا تھا بہت پیارا تھا۔ مگر بیٹا جوانی کی دھند میں ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ نہیں پا رہا تھا... ایک دن باپ نے اسے پاس بٹھا کر پوچھا۔ پڑھا لکھا جوان بیٹا سمجھدار تھا بڑے ادب سے بولا۔

''ابو جی! یاد ہے آپ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر ہزاروں میل دور پردیس آ گئے تھے کبھی سوچا تھا کہ آپ کی غیر موجودگی نے انہیں کتنا پریشان رکھا ہوگا۔ میں تو پھر بھی اسی شہر میں ہوتا ہوں۔ اور مت بھولیں کہ میں اٹھائیس سال کا ہوں۔ میری فکر نہ کیا کریں۔۔''

''مگر بیٹے! گھر میں رہ کر اس طرح راتوں کو غائب ہو جانا، میں نے تو ایک مقصد کے لئے گھر چھوڑا تھا۔'' ''تو ٹھیک ہے... میرا بھی ایک مقصد ہوتا ہے باہر رہنے کا، کچھ دیر دوستوں کے ساتھ تفریح گپ شپ کرنا، ٹھیک ہے میں بھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ چھٹی والے روز آ کے مل لیا کروں گا۔ اس طرح آپ کو پریشانی نہیں ہوگی۔۔!!''

''نہیں نہیں بیٹے! کہیں مت جانا... بس فون کر دیا کرو۔ جب رات کو نہیں آنا ہوتا...'' باپ گھبرا کر بولا... جیسے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹنے والی ہو۔ اس نے حسرت سے بیٹے کو کمرے سے جاتا دیکھا اور سوچنے لگا۔ کیسے عجیب ملک میں ہم آ گئے ہیں جس میں اتنے مضبوط رشتے بھی پتنگ جیسے ہیں جانے کب کوئی کاٹ دے اور حسرتوں کی خاردار ڈور ہاتھ میں رہ جائے۔ اس کی آنکھوں سے دو قطرے ڈھلک کر اس کے چہروں کی جھریوں میں بہہ گئے۔

***

# رسہ گیر چوہدری

(نعیم احمد باجوہ)

چوہدری کی کہانی بڑی پرانی ہے۔ ایسے ہی کوئی سرپنچ نہیں رہ سکتا۔ جان جوکھوں میں ڈالنا پڑتی ہے۔ قربانی کرنا پڑتی ہے محنت سے چوہدراہٹ قائم رکھی جاتی ہے۔ آئیں آپ کو چوہدری کی کہانی سناتے ہیں۔ صدیوں پہلے ایک بہت بڑے گاؤں جس کا نام ڈگ ڈوگوتھا کے چوہدری کی کہانی۔ یہ گاؤں اردگرد کے دیہات میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو پھنے خاں بھی سمجھتا تھا۔ یہاں کے رہنے والے بھی احساس برتری کا شکار تھے۔ یوں تو گاؤں کی چوہدراہٹ کئی خاندانوں میں رہی۔ چاچے تائے کے لڑکوں میں بٹتی رہی۔ چوپال میں کبھی چوہدریوں کی حکمرانی ہوتی تو کبھی ان کے شریکوں کی۔ یہ کھیل چلتا رہتا۔ پھر ایک چوہدری ذرا کھری ٹائپ کا آ گیا۔ یہ چوہدری، چوہدری رہنے کا گر سیکھ گیا تھا۔ نام تو اس کا دُلا ور تھا پر اس کے دشمن اسے دُلا کہہ کر اپنا غصہ نکالتے تھے۔ بعضے تو اور بھی خراب تھے وہ کبھی کبھی دال پر زبر بھی لگا لیتے تھے۔ اس کے بعض مخالف اسے رسہ گیر بھی کہتے تھے پر اس سے دُلے کو کیا فرق پڑتا تھا۔ شرم کرتا کہ چوہدراہٹ۔ اس لئے تو کسی نہ کسی بہانے چوپال سے جڑا رہتا تھا۔ سرپنچی کی کرسی چھنتی تو کوئی چھوٹی موٹی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ جاتا۔ پر رہتا ادھر ہی تھا۔ سیانا تھا جانتا تھا کہ اگر چوپال سے نکل گیا تو دوبارہ گھسنا مشکل ہوگا اس لئے کوئی نہ کوئی اسکیم لگا کر رہتا چوپال کے نیڑے تیڑے ہی تھا۔ اور کچھ نہیں تو چوہدراہٹ کا سواد لینے کے لئے اپنے محلے میں ہی چھوٹی موٹی محفل لگائے رکھتا، ایویں ہی مفت مشورے دیتا رہتا۔

شریکے سے کوئی دوسرا بندہ سرپنچ بنتا تو اندر اندر اپنے یارسجنوں کو بتایا کرتا کہ دیکھو میں سرپنچ ہوتا تو ایسے کرتا۔ یہ تو ہے ہی نکما۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج۔ اسے تو سرپنچی کرنی آتی ہی نہیں۔ دو تین پھیروں کے بعد جب اک وڈا بابا مرا تو چوہدری دُلا ور کی باری پھر آ گئی۔ آ بیٹھا چوپال کے اندر اور کرنے لگا اپنی من مانیاں۔ گاؤں کا نام ہی ڈگ ڈوگو تھا اس لئے وہاں کے لوگ چین کی بانسری نہیں چین کی ڈگ ڈگی بجاتے رہتے تھے۔ چوہدری بھی ہر مسئلہ میں پنگا لینا ضروری سمجھتا تھا۔ دو گروپوں میں لڑائی اسے سکون دیتی کہ تبھی تو اس کی چوہدراہٹ قائم رہتی تھی اس لئے اپنے بندے بھیج کر بھی تیلی لگانے سے باز نہ آتا تھا۔ لوگوں کے عقیدے بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ عقیدہ بھی اسے وہی

منظور تھا جس کی تشریح وہ کرے۔ مندروں اور عبادت گاہوں پر بھی اپنی من مرضی کرنے سے باز نہ آتا۔ سرپنچ بننے کا وقت آتا تو سب کے منتیں ترلے کرتا۔ اس وقت کوئی نیچ نیچ نہ رہتا۔ ہر ایک کے گھر جاتا اور سب کو مناتا۔ پر جونہی چوپال میں سرپنچ بن کر گھستا تو سُور ما بن جاتا۔ شادی بیاہ کے معاملے میں بھی اس نے ٹانگ اڑائی تھی۔ بیٹھے بٹھائے گاؤں کے قاضی نے اس کے کان میں پھونک دیا کہ گاؤں میں شادی بیاہ بھی چوہدری کی اجازت کے بغیر نہ ہوگا۔ جھٹ پٹ فیصلہ کر مارا کہ شادی وہی مانی جائے گی جو اس کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ اندر واندر لوگ تنگ بہت تھے پر کر کچھ نہ سکتے تھے۔ پھر ایویں ہی لوگ چوہدری کے خلاف اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ چوہدری دُلا ور کو اپنی کرسی چھنتی نظر آنے لگی۔ بڑے ہتھ پیر مارے پر کچھ بنا نہیں۔ وڈے چوہدری کے چناؤ کا دن آ گیا تو یہ بھی چوپال میں آن بیٹھا اور کروادیا ہلا گلا۔ لوگ ایک دوسرے کو مارنے لگے تو یہ اپنے حقے کی گُڑگُڑ کی طرح گُڑ کنے لگا۔ چوہدری دُلے نے بھی سوچ رکھا تھا کہ وڈی کرسی چھڈ کے بھی رہے گا وہ بھی اُدھر ہی۔ پر اس بار کی کمین اکٹھے ہو کر فیصلہ کر چکے تھے کہ چوہدری دُلے کو باہر چُک کے ماریں گے۔ کی کمین آپس میں مار مار کر لہولہان ہونے لگے تو ان کو خیال آیا کہ چوہدری دُلے کا بھی کچھ کریں۔ یہ ہمیشہ کی طرح ہمیں لڑا کر اس بار بھی نکل جائے گا۔ ایک جتھہ چوہدری کے سر بھی ہو گیا۔ طیفے نے گلہ پکڑا تو سلطانے کو بھی ہمت ہوئی۔ جارے نے مکہ دے مارا تو پھتے نے ہتھ مروڑ دیا۔ چوہدری کے کپڑے پھاڑے، ہتھ پیر توڑ کے باہر پھینک دیا۔ چند منٹوں میں چوہدری کی ساری "میں" نکل گئی۔

چوہدری بیچ چوہراہے لتاں کھلار کے بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ ٹوٹے ہاتھ اٹھا اٹھا کر بددعائیں دینے لگا۔ کہتا آج کوئی سرپنچ ہی نہیں رہا میرے لئے، کوئی مجھے بھی انصاف دے۔ اندر سے جانتا تھا کہ جب طیفے کی ماں نے اپنے جوان بیٹے کے دن دھاڑے قتل کے لئے انصاف مانگا تھا تو اس نے کب سنا تھا۔ جب مظلوموں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر بددعائیں کیں تھیں تو اس وقت تو اسے وہ سنائی نہ دی تھیں۔ آج اپنی باری آئی تو ٹوٹا ہاتھ بھی بددعا کے لئے بلند ہو گیا۔ جب کہا تھا کہ کوئی شادی بیاہ میرے حکم نامے پر دستخط کئے بغیر نہ ہو سکے گا تو ایسا فیصلہ صادر کرتے اسے کون سی شرم آئی تھی۔ جب مسلیوں اور کمیوں کے ڈور ڈنگر چوری ہوئے تو اس نے کب مدد کی تھی۔ آج چوہدری دلاور بیچ چوراہے میں بیٹھا انصاف مانگ رہا تھا پر بھول گیا تھا کہ مکافاتِ عمل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ دھوکہ اپنے اصل کی طرف لوٹ کر ہی رہتا ہے۔ حد سے بڑھا ہوا ظلم ہی ایک دن ظالم کا صفایا کر دیتا ہے۔

# SARMAD GLOBAL

CHARTERED ACCOUNTANTS

## QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS
## WITH BIG 4 EXPERIENCE

**FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT**

- ✓ Company incorporation / Registered Office Address
- ✓ Personal Income Tax Return investigations,
- ✓ Rental Income Tax Returns
- ✓ UK State Pension Entitlement Review
- ✓ Advice on filling Gaps in UK State Pension
- ✓ UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- ✓ Private UK Pension Tracing.
- ✓ Assets Review for Inheritance Tax
- ✓ Appealing-Past years HRMC Penalties
- ✓ Preparation / Filing of Prior year tax returns
- ✓ Duplicate-Payslips/ P60s

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

**SARMAD KHAN ACA, FCCA**

**OFFICE** 115 LONDON ROAD MORDEN SURREY SM4 5HP UK
TEL +44(0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
E-MAIL: INFO@SARMADGLOBAL.COM
WEB. WWW.SARMADGLOBAL.COM
**CELL +44 (0) 7903 416966**

# SAAMS FUNCTION HALL

*Catering & Event Management*

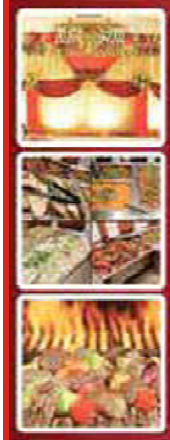

**Services Available**

- Catering Service
- Special Events
- Corporate Event
- Linen
- Crockery
- Cutlery
- Fresh Flowers
- Drinks
- Stages Decore
- Barbecue Hire

*Enquire for a Booking*

We Take reservations Everyday

Catering to your requirments
Cell:07883 815195

Under New Management
Newly Refurbished function Hall

# SHAHMASKEEN & Co.UK.Ltd

## LETTING
## SALE
## *& ALL TYPE OF*
## BUILDING WORKS

Contact:

**S M Shah**

**+447888683496**

**Z A Hashmi**

**+447705982260**

shahmaskeen01@gmail.com

# SHARIF
JEWELLERS
SINCE 1952

22K GOLD & DIAMOND JEWELLERY
GIA / HRD CERTIFIED DIAMONDS

# HUGE SALE

ENJOY UPTO

# 50% OFF

ON MAKING CHARGES
& NO MAKING ON SELECTED COLLECTIONS*

28 LONDON ROAD, MORDEN SM4 5BQ

+44 20 8075 5777
+44 7888 300 399

*Applicable taxes, terms & conditions apply. Please visit our store for details.

**FREE CONSULTATION & LEGAL ADVICE**
24 Hours Emergency Numbers

**مفت قانونی مشاورت**
24 گھنٹے ایمرجنسی سروس

# 07878 33 5000 / 07774222062


**RASHID & RASHID LAW FIRM**
211, The Broadway, Southall, UB1 1NB.
Near McDonalds Southall.
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

190 Merton High Street, Wimbledon
London SW191AX
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

**راشد اینڈ راشد لاء فرم**
211، دابراڈوے، ساؤتھ ہال، UB1 1NB نزد میکڈونلڈز ساؤتھ ہال
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

190 میرٹن ہائی سٹریٹ، ویمبلڈن
لندن SW19, 1AX
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com


## SOW THE SEEDS OF LOVE

Benefit with very competitive rates, tailored advice & service to suit your specific needs, 24 hour response to all online enquiries and our many years of experience
www.rashidandrashid.co.uk

مناسب ریٹس میں آپ کی مخصوص ضروریات کے تحت موزوں مشورہ، 24 گھنٹے آن لائن سروس اور ہمارا سالوں کا تجربہ

- Asylum & Immigration
- New Point Based System
- Settlement Application (ILR)
- European Law
- Nationality & Travel Documents
- Human Rights Applications
- High / Court of Appeals
- Family Matters and Divorce
- Switching Visas
- Over Stayers
- Legacy Cases
- Work Permits
- Visa Extensions
- Judicial Reviews
- Tribunal Appeals
- Student appeals

- اسائلم/سیاسی پناہ اور امیگریشن
- نیا پوائنٹ بیسڈ امیگریشن سسٹم
- ویزا میں تبدیلی
- ویزا توسیع/ایکسٹینشن
- سیٹلمنٹ درخواست (ILR)
- یورپین قانون
- اوور سٹیئرز
- جوڈیشل ریویو
- نیشنیلٹی اور سفری دستاویزات
- درخواست برائے انسانی حقوق/ہیومن رائٹس
- وراثتی معاملات/لیگیسی کیس
- ٹرائبیونل اپیل
- ہائی/کورٹ آف اپیل
- طلاق و دیگر خاندانی معاملات
- ورک پرمٹ
- سٹونٹس اپیل

**RASHID & RASHID**
Solicitors, Advocates
Immigration Specialists
Commissioners of Oaths

**راشد احمد خان**
وکیل (پرنسپل)